قیمت: -/40 ₹ جلد: 10 شمارہ: 01-03

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی

# جریدہ حیاتِ نو

جولائی تا ستمبر ۲۰۲۶ء (محرم الحرام تا ربیع الاوّل ۱۴۴۸ھ)

اس شمارے کا خصوصی گوشہ

## آگہی کے چراغ

”اسلامی نیا سال: ہجرت، محرم اور عصر حاضر کے تقاضے“

اس اہم فکری تھیم پر مبنی ۹ خصوصی مضامین مجلّے کی زینت ہیں

مڈل ایسٹ میں ملازمت کے خواہش مند حضرات کے لیے

ایک قابلِ اعتماد ادارہ

# الھند فارن سروس ایجنسی

اگر آپ میڈیکل لائن سے متعلق ہیں

اگر آپ کوئی ہنر جانتے ہیں

اگر آپ صرف پڑھے لکھے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہنر نہیں ہے

اگر آپ عام لیبر یا مزدور ہیں

تو آپ اپنے پاسپورٹ کی کاپی، فوٹو اور بائیو ڈاٹا ہمیں دیجیے... اور
دیگر تفصیلات کے لیے ہماری اطلاع کا انتظار کیجیے۔

وكالة الهند للخدماتِ الأجنبية

# AL - HIND FOREIGN SERVICE AGENCY

Registration No.: B-0376/DEL/PER/1000+/5/1263/1984

**Head Office:**
No. 73, Main Road, Near SBI
Zakir Nagar, New Delhi-110 025 (India)

Phone: 0091-11-26983980, 26983981
0091-11-26988375 / 76

**Branch Office:**
38, G.F. Ashoka Shopping Complex,
Near G.T. Hospital
L.T. Road, Mumbai - 400 001 (India)

Phone: 0091-22-22652906

E-mail: info@al-hind.com

**Website: www.al-hind.com**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی

# جریدہ حیاتِ نو

# Hayat -e-Nau

July - September 2026


Volume: 10 جلد | Issue: 1-3 شمارہ | جولائی تا ستمبر ۲۰۲۶ء (محرم الحرام تا ربیع الاول ۱۴۴۸ھ)



ایڈیٹر

خبیب کاظمی

+91 80909 13853
hayatenau.atq@gmail.com

‎₹150/- سالانہ | ‎₹40/-

مجلس ادارت

- عبداللہ زکریا ندیم (ممبئی)
- شمشاد حسین (نئی دہلی)
- امتیاز وحید (کولکاتا)
- نعمان بدر (علی گڑھ)
- سدید ازہر (تمل ناڈو)
- ارشد جمال (بنگلور)
- ذوالقرنین حیدر سبحانی (ملیشیا)

مجلس مشاورت

- مشرف حسین صدیقی (دہلی)
- موسیٰ کلیم (متحدہ عرب امارات)
- صابر شمیمی (ریاض)
- محمد سہیل (کویت)
- محمد ارشد عالم (دہلی)
- فیروز طیب (قطر)



**Printed, Published & Owned** by Sayyed Rashid Hamdi, F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
**Printed at:** Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006.
**Published at:** F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
**Editor:** Khubaib Ahmad Kazmi



مضمون نگار کے خیالات سے ادارہ یا انجمن کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| حرف آغاز: | رکے تھے، بکھرے نہیں تھے | اداریہ | 4 |
| زادِ راہ: | پیغام | مولانا انیس احمد فلاحی مدنی | 6 |
| خصوصی انٹرویو: | اتحادِ فارغین اور انجمن کا مستقبل | محمد ارشاد عالم | 7 |
| انوار قرآن: | اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو | محی الدین غازی | 11 |
| اسوۂ رسول: | سیرتِ نبوی ﷺ اور روحانی زندگی کا موجودہ خلا | شمشاد حسین فلاحی | 14 |
| نقوش صحابہ: | ایثارِ انصار ایمان کی ایک درخشاں تصویر | ابوعبادہ عظیم فلاحی | 17 |
| فکر و نظر: | شکرانِ نعمت کا اسلامی طریقہ | ڈاکٹر رضوان الحق فلاحی | 19 |
| آگہی کے چراغ: | مرکزی موضوع ـ اسلامی نیا سال: ہجرت، محرم اور عصر حاضر کے تقاضے | | |
| | ماہِ محرم الحرام: فضائل و برکات اور پیغامِ عاشورہ | سروری بانو | 23 |
| | اسلامی نیا سال: ماضی کا احتساب اور مستقبل کا لائحہ عمل | یاسر انعام فلاحی | 26 |
| | ہجرتِ مدینہ اور عالمگیر اسلامی تحریک کا عروج | سید اسد اللہ کاظمی | 29 |
| | پیغامِ ہجرت اور عصرِ حاضر کا مسلم بحران | بلال احمد فلاحی | 32 |
| | اسوۂ حسنینؓ اور باطل کے سامنے فکری و عملی استقامت | فیاض احمد فلاحی مدنی | 36 |
| | محرم الحرام کا پیغام: اتحادِ امت اور باہمی احترام کی ضرورت | سید مطیع الرحمٰن حنیف | 40 |
| | نئے سال کا عزم: عصرِ حاضر میں اقامتِ دین کی جدوجہد | محمد ضیاء القمر فلاحی | 42 |
| | ہجرتِ مدینہ کا پیغام: تعمیرِ ملت میں نوجوانوں کا کردار | ضیاء الرحمٰن عابد فلاحی | 46 |
| | خواتینِ اسلام اور سفرِ ہجرت | اسامہ احسن صدیقی | 49 |
| افکارِ تازہ: | سوشل میڈیا، لبرل ازم اور مسلم ذہن پر نئی تہذیبی یلغار | ڈاکٹر اسماء فیروز | 52 |
| احوال عالم: | جب طاقت سوال کے کٹہرے میں کھڑی ہو جائے | ابوخزیمہ فلاحی | 62 |
| ابلاغ و میڈیا: | عہدِ اطلاعات میں مسلم ذہن کا محاصرہ | عبداللہ ندیم | 68 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| یادِ رفتگاں: | وہ چراغِ سحر تھا، بجھ گیا مگر روشنی باقی ہے | خبیب کاظمی | 74 |
| اعترافِ خدمت: | پروفیسر غفران احمد مرحوم۔ آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا | محمد ارشد جمال | 85 |
| قند مکرر: | دھڑکنیں | انصار احمد فلاحی۔ بلریا گنج | 98 |
| رہنمائے تعلیم: | عرب جامعات میں داخلہ: طریقہ کار اور رہنمائی | عمار جاوید خان | 101 |
| بزمِ سخن: | آن لائن مشاعرہ: بزمِ سخن سے بزمِ زوم تک | ابنِ ابو بٹن | 102 |
| | نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم | خبیب کاظمی | 107 |
| | اے ہلال سال نو! | سرفراز بزمی | 108 |
| | ترانہ فلاح | شبنم سبحانی | 110 |
| | غزل | سعید اختر اعظمی | 112 |
| | غزل | سالم سلیم | 112 |
| | غزل | شاکر الاکرم | 113 |
| آئینہ جامعہ: | جامعۃ الفلاح: ایک تعارف | محمد ارشاد عالم | 114 |
| | جامعہ میں نئی تقرریاں | مصباح الباری | 115 |
| | دوروزہ تربیتی ورکشاپ | ادارہ | 117 |
| | اپنی شخصیت کی تعمیر کیسے کریں؟ (توسیعی لکچر۔ ڈاکٹر طٰہٰ عبدالمتین) | ادارہ | 119 |
| | فنِ خطابت اور اس کے آداب۔ جمعیۃ الطلبہ کا تربیتی پروگرام | ادارہ | 120 |
| | جمعیۃ الطلبہ وطالبات کے لیے نئی میقات کا آغاز | ادارہ | 121 |
| رفتِ کارواں: | حیاتِ نو کی حیاتِ تازہ | ڈاکٹر محمد اسامہ عظیم فلاحی | 122 |
| | مختلف یونٹوں کے نومنتخب عہدیداران | ادارہ | 124 |
| | قلم کارانِ حیاتِ نو | ادارہ | 125 |
| | حیاتِ نو۔ عکس و آواز | ادارہ | 127 |

# رکے تھے، بکھرے نہیں تھے

کبھی کبھی دورانِ سفر ایسے موڑ آجاتے ہیں جہاں قدموں کی رفتار کم ہوجاتی ہے، قافلے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتے ہیں اور راستے کی گرد بیٹھنے لگتی ہے۔ لیکن ہر توقف اختتام نہیں ہوتا اور ہر خاموشی شکست کی علامت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہی وقفے نئے عزم اور نئے آغاز کا ذریعہ بنتے ہیں۔

''حیاتِ نو'' آج اسی احساس کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ صرف ایک نئے شمارے کی آمد نہیں، بلکہ ایک علمی روایت کی تجدید اور ایک فکری سفر کے دوبارہ آغاز کا اعلان ہے۔

سنہ 1978ء سے جاری یہ جریدہ جامعۃ الفلاح کی علمی وفکری روایت، فارغین کے باہمی ربط اور دعوتی شعور کی علامت ہے۔ اس کے صفحات میں نسلوں کی محنتیں، اہلِ قلم کی کاوشیں اور ایک بڑے مقصد کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

گزشتہ عرصے میں کچھ حالات ایسے پیش آئے جن کے باعث اس سفر میں وقفہ آیا۔ اختلافات اجتماعی زندگی کا حصہ ہیں۔ مزاج، رائے اور زاویۂ نگاہ کا فرق انسانی فطرت ہے۔ لیکن ہر اختلاف دشمنی نہیں ہوتا، اور ہر رائے کا فرق تعلقات ختم کرنے کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ وہ اختلاف جو فکر کو وسعت دے، باعثِ خیر ہے، لیکن جو دلوں میں فاصلے پیدا کرے، اس پر نظرِ ثانی ضروری ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ آج ہم ایک نئے عزم کے ساتھ پھر جمع ہیں۔ ہم رکے تھے، بکھرے نہیں تھے۔ ہمارے درمیان تعلق کی بنیاد ایک مشترک مقصد، مشترک نسبت اور مشترک امانت ہے۔ قافلے راستے کی رکاوٹوں سے نہیں، اپنی منزل سے پہچانے جاتے ہیں۔

حیاتِ نو ایک فکری و تنظیمی امانت ہے۔ یہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے فلاحی برادران کے درمیان تعلق اور وابستگی کا ذریعہ ہے، خصوصاً مشرقِ وسطیٰ میں مقیم فلاحی برادری کے لیے مادرِ علمی سے وابستگی کی ایک زندہ علامت ہے۔ یہ جریدہ مشرقِ وسطیٰ میں مقیم فلاحی فضلاء کی علمی و دعوتی سرگرمیوں اور ہندوستان کی تعلیمی وفکری روایت کے درمیان ایک رابطے کی کڑی ہے، جو دونوں جہتوں کے تجربات اور افکار کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اسی مقصد کے تحت اس شمارے میں قرآن، سیرتِ رسول ﷺ، صحابہ کرام کی زندگیوں، عصرِ حاضر کے فکری مسائل، تعلیم و تربیت، ادب اور دیگر علمی گوشوں کو شامل کیا گیا ہے۔

ہم نے "آگہی کے چراغ" کے عنوان سے ایک نئے گوشے کا آغاز کیا ہے، جس کا مقصد نئے قلم کاروں کو اظہار کا موقع دینا، ان کی فکری و تحریری تربیت کرنا اور پختہ کار اہلِ قلم کی رہنمائی سے استفادہ کرنا ہے۔ ہر شمارے میں ایک مرکزی موضوع منتخب کیا جائے گا، جس کے تحت سات سے دس ذیلی عناوین پر مختصر اور جامع مضامین پیش کیے جائیں گے۔ اس شمارے میں "اسلامی نیا سال: ہجرت، محرم اور عصرِ حاضر کے تقاضے" کو مرکزی عنوان بنایا گیا ہے۔

قارئین اور فلاحی برادری کے لیے یہ خوش خبری بھی ہے کہ طویل تعطل کے باعث غیر فعال ہونے والی حیاتِ نو کی ویب سائٹ اور آن لائن آرکائیو الحمدللہ دوبارہ بحال ہو چکے ہیں، اور اب سابقہ شمارے دوبارہ دستیاب ہیں۔ ایک مخلص فلاحی کے تعاون سے یہ مرحلہ مکمل ہوا۔ ہماری کوشش ہے کہ آئندہ مضامین کو یونیکوڈ متن کی صورت میں بھی پیش کیا جائے، تاکہ استفادہ مزید آسان ہو سکے۔

اس شمارے میں کچھ نئی جہتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ "قندِ مکرر" کے عنوان سے قدیم شماروں کی منتخب علمی و ادبی تحریریں دوبارہ پیش کی جائیں گی، تاکہ ہمارا علمی سرمایہ نئی نسل تک پہنچے۔ اسی طرح "حیاتِ نو: عکس و آواز" کے ذریعے اہم خطبات اور علمی پروگراموں تک ڈیجیٹل رسائی کی سہولت بھی فراہم کی گئی ہے۔

آج کے دور میں جہاں معلومات کی فراوانی ہے وہیں گہری فکر کی کمی محسوس ہوتی ہے، سنجیدہ مطالعہ اور بامقصد تحریر کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ چند لمحوں کی مصروفیت انسان کو مشغول تو رکھ سکتی ہے، لیکن چند صفحات کا مطالعہ اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ہماری دعا اور کوشش ہے کہ حیاتِ نو کا یہ سفر صرف سہ ماہی اشاعت تک محدود نہ رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ دن بھی آئے جب یہ ماہنامہ کی صورت میں زیادہ وسیع حلقے تک پہنچے اور علم، فکر اور دعوت کا ذریعہ بنے۔

ہم اپنے قارئین، اہلِ قلم اور بالخصوص تمام فلاحی برادران سے تعاون، تجاویز اور دعاؤں کے طلب گار ہیں۔ آیئے! ماضی کو تجربہ، حال کو عزم اور مستقبل کو امید بنائیں۔

اللہ تعالیٰ حیاتِ نو کو علمِ نافع، فکرِ صالح اور عملِ خیر کا ذریعہ بنائے۔

آپ کا مخلص
خبیب کاظمی

# پیغام

’’حیاتِ نو‘‘ کی اشاعت کا فیصلہ بے حد خوش آئند ہے۔ اس کی اشاعت کی خبر سن کر دل جذبۂ شکر سے معمور اور خوشی و مسرت سے لبریز ہو گیا۔ امید ہے کہ اس کا سلسلہ، ان شاء اللہ، مستقل جاری رہے گا اور یہ مجلہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں مؤثر کردار ادا کرے گا۔

رائے عامہ کی صحیح تشکیل، معاشرے کی اصلاح، اخلاق کی درستی، معلومات کی تصحیح، اور علمی و تحقیقی صلاحیتوں کی آبیاری میں معیاری رسائل و جرائد کی اہمیت اہلِ علم پر مخفی نہیں۔ زندہ قومیں اپنے افکار کی حفاظت اور اپنی نئی نسل کی فکری رہنمائی کے لیے ایسے علمی ذرائع کو ہمیشہ مضبوط بناتی ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات، ان کے اسباب و عوامل کا سنجیدہ مطالعہ، اور ان کے تدارک کے لیے مؤثر منصوبہ بندی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آج جس ہمہ گیر فکری یلغار کا ہم سامنا کر رہے ہیں، اگر اس کا بروقت اور حکیمانہ مقابلہ نہ کیا گیا تو مسلم سماج کا ایک بڑا طبقہ اپنی دینی و تہذیبی شناخت سے محروم ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ’’حیاتِ نو‘‘ اس اہم میدان میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے فکری رہنمائی، علمی بیداری اور اصلاحِ احوال کا فریضہ پوری سنجیدگی کے ساتھ انجام دے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ برادرانِ فلاح کو استقامت عطا فرمائے، جامعۃ الفلاح اور انجمن کے مقاصد کے حصول کے لیے انہیں اخلاص، بصیرت اور مسلسل جدوجہد کی توفیق بخشے، اور ’’حیاتِ نو‘‘ کو امت کے لیے نفع بخش اور دیرپا علمی سرمایہ بنائے۔ آمین۔

مولانا انیس احمد فلاحی مدنی
(ناظم جامعۃ الفلاح)
22 جولائی 2026

# اتحادِ فارغین اور انجمن کا مستقبل

## نومنتخب صدرِ انجمن جناب طارق اکرام اللہ فلاحی صاحب سے خصوصی گفتگو

### انٹرویو کار: محمد ارشاد عالم فلاحی

ویڈیو انٹرویو دیکھنے کے لیے QR کوڈ اسکین کریں۔

**سوال:** سب سے پہلے آپ کو انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا نویں صدر منتخب ہونے پر مبارک باد۔ آپ جامعۃ الفلاح کے اولین ادوار کے فارغین میں سے ہیں۔ 1976ء میں فراغت کے بعد آپ نے تعلیمی، سماجی اور رفاہی میدانوں میں طویل خدمات انجام دیں، بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کی، سعودی سفارت خانے میں ذمہ داریاں نبھائیں، مختلف سماجی اداروں سے وابستہ رہے اور اس وقت بھی متعدد تعلیمی اداروں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ایسے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیں گے کہ بطور صدرِ انجمن آپ کا بنیادی وژن کیا ہے؟ آپ انجمن کو کس سمت میں لے جانا چاہتے ہیں؟

**جواب:** صدرِ انجمن۔ طارق اکرام اللہ فلاحی

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع دیا۔

میرے نزدیک انجمن طلبۂ قدیم ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں جامعۃ الفلاح کے فارغین ایک دوسرے سے ملتے ہیں، تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور اپنے تجربات وافکار کا اشتراک کرتے ہیں۔ برنارڈ شا کا ایک معروف قول ہے کہ اگر دو افراد ایک ایک سیب کا تبادلہ کریں تو ہر ایک کے پاس ایک ہی سیب رہے گا، لیکن اگر دونوں اپنے اپنے خیالات کا تبادلہ کریں تو ہر ایک کے پاس دو خیالات ہوں گے، بلکہ ایک نیا خیال بھی جنم لے سکتا ہے۔ یہی انجمن کی اصل روح ہے۔

انجمن بذاتِ خود کوئی الگ مقصد رکھنے والی تنظیم نہیں، بلکہ جامعۃ الفلاح کے مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ جامعہ نے اپنے طلبہ کی جو فکری و دینی تربیت کی ہے، اس کے اثرات عملی زندگی میں نمایاں ہوں، فارغین معاشرے میں ان اقدار کو عام کریں اور مادرِ علمی کی ہر ممکن معاونت کریں، یہی انجمن کے بنیادی مقاصد ہیں۔ اس کے علاوہ باہمی تعاون، رفاہی سرگرمیاں، مشاورت اور ضرورت مندوں کی مدد جیسی خدمات یقیناً اہم ہیں، مگر وہ اس بنیادی مقصد کی توسیع ہیں۔

سوال: آپ سے پہلے بھی انجمن کے مختلف صدور نے اپنے اپنے دور میں خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کے دورِ صدارت کو ان سے کس اعتبار سے مختلف سمجھا جائے؟

جواب: یہ حقیقت ہے کہ میری مصروفیات غیر معمولی نوعیت کی ہیں اور میں مختلف اداروں میں عملی ذمہ داریاں ادا کر رہا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں نے صدارت سنبھالتے ہی ایک بات کو اپنی اولین ترجیح بنایا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں انجمن بعض داخلی اختلافات اور انتشار کا شکار رہی ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ مختلف الخیال فارغین کو ایک بار پھر جامعۃ الفلاح کے مشترکہ مقاصد کے تحت ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارغین نے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ انجمن میں اتحاد، اعتماد اور باہمی تعاون کی فضا مضبوط ہو۔ میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اس سمت میں کام کرنا چاہتا ہوں۔

سوال: آپ مختلف سماجی اور رفاہی اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ ایسے میں انجمن کے مقاصد اور آپ کے ذاتی وژن میں کس حد تک ہم آہنگی ہے؟ اور ان مقاصد کو عملی شکل دینے کے لیے

آپ کی حکمتِ عملی کیا ہوگی؟

جواب: بعض لوگوں کی طرف سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ میں مختلف دباؤ کے تحت کام کرتا ہوں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میری کسی سے ذاتی وابستگی یا مفاد وابستہ نہیں ہے کہ میں کسی دباؤ کو قبول کروں۔

میرے تعلقات مختلف دینی اور سماجی حلقوں سے ضرور ہیں، کیونکہ معاشرے میں رہتے ہوئے تعلقات کے بغیر کوئی اجتماعی خدمت ممکن نہیں ہوتی۔ سعودی سفارت خانے میں خدمات کے دوران بھی مجھے قومی سطح پر کام کرنے کا موقع ملا، خصوصاً مساجد، مدارس، ہسپتالوں اور رفاہی منصوبوں کے سلسلے میں۔ بعد میں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف سماجی اور ملی خدمات کی توفیق عطا فرمائی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی تجربات انجمن کے لیے بھی مفید ثابت ہوں گے اور انہیں فارغین کی خدمت اور جامعہ کی ترقی کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

سوال: آج جامعۃ الفلاح کے فارغین ملک و بیرونِ ملک مختلف شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے درمیان مضبوط روابط اور مؤثر نیٹ ورکنگ کے لیے آپ کا کیا منصوبہ ہے؟

جواب: الحمدللہ، مجھے ملکی و بین الاقوامی سطح پر متعدد تعلیمی وسماجی اداروں اور اکابرین کے ساتھ کام کرنے کا وسیع تجربہ حاصل ہے۔ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ (سعودی عرب) میں طالب علمی اور کونسلر کی حیثیت سے خدمات کے دوران، مجھے جامعہ کی طرف سے ہندوستان، بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا، مالدیپ اور برما کے لیے اعزازی خصوصی نمائندہ بھی مقرر کیا گیا۔ بعدازاں، سعودی ہائر ایجوکیشن کی طرف سے یورپ کے تعلیمی مشن کے لیے میرا انتخاب ہوا، اور اب بھی میں بین الاقوامی نوعیت کے فعال مسلم اداروں سے منسلک ہوں۔

ان تجربات نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی کہ روابط ہی ترقی کی بنیاد ہیں۔ میری خواہش ہے کہ معاش کی غرض سے بیرونِ ملک مقیم ہمارے فارغین کے مابین ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو، جس سے باہمی مشوروں اور تجربات کا تبادلہ آسان ہوسکے۔

اس سمت میں پہلا قدم اٹھاتے ہوئے، ہم ہندوستان اور نیپال وکویت جیسی بیرونِ ملک

علاقائی اکائیوں کے انتخابات مکمل ہونے کے فوراً بعد تمام نومنتخب صدور اور سیکریٹریوں کا ایک فعال رابطہ گروپ تشکیل دے رہے ہیں۔

جہاں تک جامعہ کی تعمیر و ترقی کا سوال ہے، تو میری ایک تعمیری شکایت یہ رہی ہے کہ ذمہ داران نے فارغین کو اس طرح اعتماد میں نہیں لیا جیسا کہ حق تھا۔ اگر مقامی فارغین کو مخلصانہ طور پر اعتماد میں لے کر دست و بازو بنایا جائے، تو جامعہ کی معاونت کا کام نہ صرف مستقل بلکہ نہایت آسان ہو جائے گا۔ اب ہمارا ہدف اسی باہمی اعتماد کی بحالی ہے۔

سوال: بزرگ فارغین کی جانب سے یہ احساس بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ ماضی کے مقابلے میں جامعۃ الفلاح کے تعلیمی اور تربیتی معیار میں کمی آئی ہے۔ آپ اس رائے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اور بطور صدرِ انجمن اس سلسلے میں انجمن کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

جواب: یہ ایک نہایت حساس اور اہم موضوع ہے، جس پر سرسری گفتگو مناسب نہیں۔ اس حوالے سے گزشتہ آن لائن شوریٰ اجلاس میں بھی بعض اراکین نے اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا، جس کے بعد طے پایا کہ اس موضوع پر الگ سے تفصیلی نشست منعقد کی جائے۔

اسی لیے آئندہ شوریٰ اجلاس میں تعلیمی و تربیتی معیار کو باقاعدہ ایجنڈے میں شامل کیا جا رہا ہے، تاکہ ذمہ دارانِ جامعہ اور اراکین کی مشاورت سے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کیا جا سکے۔

میرا یقین ہے کہ ایسے بنیادی مسائل کا حل باہمی مشاورت، مشترکہ فکر اور مثبت مکالمے ہی سے ممکن ہے، اور انجمن اس سلسلے میں اپنا تعمیری کردار ادا کرے گی۔

☆☆☆

محی الدین غازی

# اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [العلق]

(پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔)

یہ سورہ علق کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ یہ آیتیں رب کائنات کی انسان کے اوپر کی گئی کچھ خصوصی نوازشوں کا تذکرہ کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ عظیم خالق نے زمین کے تمام جانداروں کے مقابلے میں انسان کے ساتھ خصوصی معاملہ فرمایا ہے۔

سوچنے سمجھنے والے انسانوں کے لیے ان آیتوں میں غور وفکر اور رہنمائی کا بڑا سامان ہے۔ یہ آیتیں انسان کو خود شناسی کی منزلیں طے کراتی ہیں، یہاں تک کہ وہ خود آگہی سے خدا آگہی تک پہنچ جائے۔

یہاں نظمِ قرآن کا ایک لطیف پہلو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اس سورت سے پہلے سورہ والتین میں انسان کے بارے میں بتایا گیا کہ اللہ نے اسے بہترین تخلیق سے نوازا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ [التین 4]

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)

بعض لوگ احسن تقویم کا مطلب محض "بہترین صورت" سمجھتے ہیں۔ درست بات یہ ہے کہ اس تعبیر میں ظاہری حسن اور باطنی خوبیاں سبھی شامل ہیں۔

مولانا مودودی کے الفاظ میں: انسان کے بہترین ساخت پر پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو وہ اعلی درجہ کا جسم عطا کیا گیا ہے جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا گیا، اور اسے فکر وفہم اور علم وفضل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی گئی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔(تفہیم القرآن)

اور مولانا اصلاحی کے الفاظ میں: اس کی ظاہری ساخت بھی گواہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کی باطنی صلاحیتیں بھی اتنی اعلی ہیں کہ اس زمین کی تمام مخلوقات میں سے صرف وہی ان کا اہل بن سکا ہے۔(تدبر قرآن)

سورہ والتین کے فوری بعد سورہ علق میں احسن تقویم کے ایک بہت اہم پہلو کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے علم کی خصوصیت۔

انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ لکھتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پڑھتا ہے۔ لکھنے سے علم کی حفاظت ہوتی ہے اور پڑھنے سے علم کی تحصیل ہوتی ہے۔ انسان کے اندر جاننے کی جستجو بھی رکھی گئی ہے۔ یہ جستجو اسے نئی نئی دریافتوں سے روبرو کرتی ہے۔ وہ اپنی دریافتوں کو قلم بند کرتا ہے اور آنے والی نسلیں اس پر اپنے حصے کی دریافتوں کا اضافہ کرتی ہیں۔ اس طرح علم کا سفر نسل در نسل جاری و ساری رہتا ہے۔

قلم کی اہمیت کے بارے میں مولانا مودودی رقم طراز ہیں: اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔(تفہیم القرآن)

اقتدار کے لیے علم ضروری ہے اور علم کا ذریعہ قلم ہے۔ اللہ نے انسان کو زمین کی قلمرو تفویض کی اور اسے قلم کی نعمت بھی عطا کی۔

یہ آیتیں انسان کو اس کی شخصیت کے علمی پہلو کی طرف متوجہ کرتی ہیں، اپنی شخصیت کو صحیح زاویے سے دیکھنے کا طریقہ بتاتی ہیں اور اس طرح اسے وحی الہی کی قدردانی کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔

عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو بالفعل تمام علوم عطا

کر دیے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علوم حاصل کرنے کا ملکہ اس کے اندر ودیعت کر دیا گیا۔ کائنات کے سینے میں رزق کے خزانے بھی مدفون ہیں اور علم کے خزانے بھی۔ جس طرح انسان کو اللہ کے عطا کردہ رزق کے لیے محنت و مشقت کرنی ہوتی ہے اسی طرح انسان کو اللہ کے سکھائے ہوئے علم تک رسائی کے لیے محنت و مشقت کرنی ہوتی ہے۔ اس محنت و مشقت کا نتیجہ خیز ہونا بھی انسان کی خصوصیت ہے جس سے خدائے کریم نے اسے سرفراز کیا ہے۔

یہ کتنی انوکھی اور قابلِ غور بات ہے کہ دوسرے جان داروں کی طرح انسان بھی تخلیق کے ابتدائی مرحلے میں علق (خون کی پھٹکی) کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن پیدائش کے بعد سے اس کے اندر ایسی ممتاز خصوصیات کا ظہور شروع ہونے لگتا ہے جو کسی اور جان دار میں ذرا بھی نہیں پائی جاتیں۔

انسان کو جس لمحے یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ وہ خاص مخلوق ہے، اس کے لیے اپنے مقصدِ وجود کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور زندگی اور کائنات کے بڑے بڑے عقدے حل ہونے لگتے ہیں۔

ربّ اکرم کی شانِ کریمی کو اگر انسان ہی نہ سمجھے، جس پر اس کا اتنا زیادہ ابرِ کرم برسا ہے تو یہ اس کی کتنی بڑی بدنصیبی اور محرومی ہے۔

یاد رہے کہ خاص ہونے اور بلند مقام سے سرفراز ہونے میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ انسان خاص ہے ان خصوصیات کی وجہ سے جو اس کے اندر رکھی گئی ہیں اور وہ بلندی کا سفر طے کرتا ہے جب وہ ان خصوصیات کا حق پہچانتا اور ادا کرتا ہے۔ جو شخص ان خصوصیات کے حق سے غفلت برتتا ہے وہ بلندی کے بجائے پستی کا راستہ اختیار کر کے اسفل سافلین ہو جاتا ہے۔

جن خوش نصیب انسانوں کو وحیِ الٰہی سے وابستگی کی نسبت حاصل ہو جائے، انھیں اپنے خاص مقام کو سمجھنے اور اس کے تقاضے ادا کرتے ہوئے بلندی کا سفر طے کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔

☆☆☆

شمشاد حسین فلاحی

# سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور روحانی زندگی کا موجودہ خلا

وجودہ دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ انسانی زندگی بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔ دولت، شہرت اور سماجی مقام حاصل ہونے کے باوجود بہت سے لوگ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتے ہیں، جسے ماہرینِ نفسیات اور مذہبی مفکرین" روحانی خلا" سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ خلا دراصل انسان کی اس فطری ضرورت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے تعلق قائم رکھے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ ظاہری آسائشوں کے باوجود انسان نے حقیقی سکون کی تلاش میں دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کی۔ آج کے ترقی یافتہ اور مادہ پرست معاشروں میں یہ روحانی بے اطمینانی مزید نمایاں نظر آتی ہے۔

ایسے دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ انسانیت کے لیے ایک مکمل رہنمائی پیش کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی روحانیت اور مادیت کے درمیان ایسا حسین توازن پیش کرتی ہے جس میں دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں اور آخرت کی فکر بھی۔

انسانی زندگی کو روحانی سکون سے ہم کنار کرنے والی تین بنیادی چیزیں سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے واضح ہوتی ہیں:

اول: آخرت کی جواب دہی کا پختہ احساس،

دوم: اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور خدمتِ خلق،

سوم: اللہ تعالیٰ کا مسلسل ذکر اور اس سے تعلق۔

انسان اگر یہ یقین رکھے کہ اسے ایک دن اپنے رب کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے تو یہ احساس اسے برائیوں سے بچاتا اور اللہ سے جوڑے رکھتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔) آل عمران:185

اور فرمایا:

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ، وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا) الزلزلہ:7-8

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اسی احساسِ آخرت کی عملی تصویر تھی۔ دنیا کی محبت سے بے نیاز رہتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روحانی ترقی اور مادی ضرورتوں کے درمیان ایسا متوازن تصور دیا کہ انسان دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کو اپنا اصل مقصد بنائے۔

فکرِ آخرت کا یہی احساس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نیکی کے کاموں میں سبقت پر آمادہ رکھتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس انسان کو کس قدر متحرک اور ذمہ دار بنا دیتا ہے۔

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا نمایاں پہلو خدمتِ خلق ہے۔ اسلام نے صرف اللہ کے حقوق نہیں بلکہ بندوں کے حقوق کو بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشتہ داروں، عام انسانوں، کمزور طبقات اور تمام مخلوقات کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اللہ بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

اور فرمایا:

بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش ہو۔

یہی وہ تعلیم ہے جو انسان کو خودغرضی اور مادہ پرستی سے نکال کر دوسروں کے لیے باعثِ خیر بناتی ہے۔ کسی ضرورت مند کی مدد، کسی پریشان حال کو سہارا دینا اور حتیٰ کہ مسکرا کر ملنا بھی سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نیکی اور روحانی مسرت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

تیسرا اہم پہلو ذکرِ الٰہی ہے۔ ذکر کا مطلب صرف مخصوص عبادات تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر لمحے میں اللہ سے تعلق قائم رکھنا ہے۔ کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینا، نعمت پر شکر ادا کرنا، کسی اچھی چیز پر سبحان اللہ کہنا اور غلطی پر استغفار کرنا انسان کے معمولات کو عبادت بنا دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ انسان دنیا کے معاملات انجام دیتے ہوئے بھی اپنے رب سے تعلق قائم رکھ سکتا ہے۔ یہی تعلق حقیقی سکون کا سرچشمہ ہے۔

آج دنیا روحانی بحران کا شکار ہے۔ انسان سکون کی تلاش میں مختلف راستے اختیار کر رہا ہے، لیکن حقیقی اطمینان اسے اسی وقت حاصل ہوگا جب وہ اپنے خالق سے اپنا تعلق مضبوط کرے گا۔ رسول کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ آج بھی انسانیت کے تمام فکری، اخلاقی اور روحانی مسائل کے لیے بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود بھی اس سرچشمے سے فیض حاصل کریں اور دوسروں تک بھی اس روشنی کو پہنچائیں۔

☆☆☆

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ"

(آلِ عمران:31)

اے نبی!

کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

انسانی روح کی اصل تسکین اور قلبی سکون صرف اور صرف اسوۂ حسنہ کی پیروی میں مضمر ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کو سیرتِ طیبہ کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو اسے نہ صرف دنیاوی مضطرب فکر سے نجات ملتی ہے، بلکہ وہ مقامِ محبتِ الٰہی پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہی اتباعِ رسول ﷺ ہمارے تمام اخلاقی، روحانی اور فکری مسائل کا واحد اور کامل حل ہے۔

ابوعبادہ عظیم فلاحی

# ایثارِ انصار ایمان کی ایک درخشاں تصویر

چشمِ فلک اور گردشِ لیل ونہار نے نہ تو کبھی نبوی معاشرے کی طرح کوئی معاشرہ دیکھا ہوگا، اور نہ ہی آفتاب و ماہتاب نے اس جیسے بے نظیر و بے مثال معاشرے پر ضیا پاشی کی ہوگی۔ وہ نبوی معاشرہ جو آج کے فاسد و مادیت زدہ سماج میں کسی خواب کی طرح نظر آتا ہے، اگر قرآنِ مجید، سیرتِ نبویہ اور کتبِ تاریخ نے اس کے نقوش کو محفوظ نہ رکھا ہوتا تو شاید ہم اسے بھی افسانۂ عنقا ہی سمجھتے۔

قرآنِ مجید میں اس مثالی معاشرے کی روشن جھلکیاں جابجا بکھری ہوئی ہیں، جن میں سے ایک نہایت حسین تصویر سورۂ حشر کی آیت 9 اور 10 میں انصار صحابہ کرام کے مہاجرین کے ساتھ بے مثال تعلقات کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انصار کی چند عظیم صفات کا ذکر فرمایا: محبت، دلوں کی پاکیزگی، تنگ دستی کے باوجود ایثار، اور سابقینِ ایمان کے لیے دعا۔

ذرا چشمِ تصور میں مہاجر صحابہ کی مدینہ آمد کا منظر لائیے کہ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اپنا گھر، مال، وطن اور اہل وعیال چھوڑ کر ایک نئی بستی میں آ رہے ہیں، اور دوسری طرف انصار ہیں جو بغیر کسی سابقہ تعلق اور تعارف کے کھلے دل سے ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ وہ ان کے سامان اٹھاتے ہیں، اپنے گھروں میں جگہ دیتے ہیں، ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور محبت و اخلاص کے ساتھ انہیں اپنا بھائی بنا لیتے ہیں۔ یہ محبت کسی دنیاوی منفعت یا مادی غرض پر مبنی نہ تھی، بلکہ ایمان کی وہ قوت تھی جس نے دلوں کو اس طرح جوڑ دیا کہ پوری تاریخِ انسانی میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آج کے دور میں جہاں تعلقات اکثر مفادات کے گرد گھومتے ہیں، انصار کی یہ بے لوث محبت ہمارے لیے ایک عظیم سبق ہے۔

انصار کی دوسری نمایاں صفت ان کے دلوں کی پاکیزگی تھی۔ وہ کینہ، حسد اور بغض سے بالکل خالی تھے۔ بنو نضیر کے اموالِ فئے جب اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے لیے خاص فرمائے تو انصار کے دلوں میں ذرہ برابر بھی ملال پیدا نہ ہوا۔ انہوں نے نہ شکوہ کیا، نہ کسی محرومی کا احساس ظاہر کیا، بلکہ اخلاص اور رضا کے ساتھ اس فیصلے کو قبول کیا۔ منافقینِ مدینہ نے بارہا کوشش کی کہ انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف پیدا کیا جائے، لیکن وہ ان پاکیزہ دلوں میں نفرت کا بیج نہ بو سکے۔ غزوۂ بنو المصطلق

کے موقع پر عبد اللہ بن ابی نے انصار و مہاجرین کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ بھی ختم ہو گیا۔

انصار کی تیسری عظیم صفت ان کا جذبۂ ایثار ہے۔ ایثار کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت اور تنگ دستی کے باوجود دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ خوش حالی میں کسی کے لیے کچھ کر دینا آسان ہے، لیکن اپنی ضرورت کے وقت کسی دوسرے کی ضرورت کو مقدم کرنا اخلاق کی بلند ترین منزل ہے۔

مواخاتِ مدینہ کے بعد انصار صحابہؓ نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی، اپنے مال میں شریک کیا، اپنے باغات اور کھیت پیش کیے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنے خاندانی معاملات تک میں ایثار کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعات انسانی تاریخ میں ایثار اور قربانی کی بے مثال مثالیں ہیں۔ ایثار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نفس کی تنگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو اپنے نفس کی تنگی سے محفوظ رکھے گئے، وہی کامیاب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خیر اور بھلائی کے تمام کام اسی وقت ممکن ہوتے ہیں جب دل کشادہ ہو، انسان دینے کا حوصلہ رکھتا ہو اور اللہ کی راہ میں اپنی صلاحیتوں، مال اور وقت کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو۔

آیت کے آخری حصے میں اس تیسرے گروہ کا ذکر ہے جو مہاجرین و انصار کے بعد آیا۔ اس میں تابعین اور قیامت تک آنے والے وہ اہل ایمان شامل ہیں جو صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ ان کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں کو حسد، بغض اور کدورت سے پاک رکھتے ہیں، اپنے لیے بھی مغفرت مانگتے ہیں اور اپنے سے پہلے گزرنے والے اہل ایمان کے لیے بھی دعا کرتے ہیں۔

یہ آیات دراصل امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم دستور ہیں کہ اس کے افراد کے درمیان زمان و مکان، نسل اور وطن کی حدود سے بالاتر ایمانی رشتہ قائم رہے۔ پہلی نسلوں کی قربانیاں بعد والی نسلوں کا سرمایہ اور میراث بنیں، اور ہر مومن اپنے پیش رو اہل ایمان کے لیے محبت و خیر خواہی کا جذبہ رکھے۔

یہ پاکیزہ تصویر اس ذہنیت سے بالکل مختلف ہے جو نفرت، طبقاتی دشمنی اور باہمی تصادم کو فروغ دیتی ہے۔ ایمان کی بنیاد پر قائم اخوت انسانیت کو بلندی عطا کرتی ہے، جبکہ بغض و حسد انسان کو پستیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

انصار کی یہ تابندہ مثال ہمیشہ ہمارے سامنے رہے کہ ایمان کی راہ میں اصل سرمایہ کشادہ دلی، ایثار، محبت اور دلوں کی پاکیزگی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان پاکیزہ صفات سے آراستہ فرمائے، نفس کی تنگی سے بچائے، اور دین کی خدمت کے لیے اخلاص و قربانی کا جذبہ عطا فرمائے۔ ☆☆☆

ڈاکٹر رضوان الحق فلاحی (گورکھپور)

# شکرانِ نعمت کا اسلامی طریقہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ مستقل سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں پر بلاتفریقِ رنگ ونسل بے شمار احسانات کرتا رہتا ہے، اور پھر اپنے بندے سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس پر مناسب ردِعمل یعنی شکرگزاری کا اظہار کرے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا صاف اعلان ہے: لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ، یعنی اگرتم شکرادا کروگے تو میں تمہیں مزید دوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔ (سورہ ابراہیم: 7)

## شکر کا قرآنی پیٹرن

اگر ہم قرآنِ کریم کی آخری سورتوں پر غور کریں، تو اللہ رب العزت نے ہر احسان کے بدلے میں شکرانے کا ایک خاص طریقہ اور پیٹرن سکھایا ہے:

1. سورۃ الضحیٰ میں تین بڑے احسانات کا ذکر کیا جو نبوت سے قبل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے گئے۔
   - آپ یتیم تھے، اللہ نے کفالت فرمائی اور آپ کی تربیت کا بہترین انتظام فرمایا۔
   - آپ ہدایت کی تلاش میں سرگرداں تھے، اللہ نے ہدایت کا بہترین سامان بہم پہنچایا۔
   - آپ مالی اعتبار سے کمزور تھے، اللہ نے غنی بنادیا۔

   پھر ان تین احسانوں کے شکریہ کے لئے تین مطالبات رکھے کہ،
   - آپ بھی یتیموں کے سرپر دست محبت رکھیں۔
   - ناداروں سے ترش روئی سے نہ پیش آئیں اور
   - رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہیں۔
2. سورہ الم نشرح میں فرمایا کہ آپ کو شرحِ صدر سے فیضیاب کیا، آپ پر سے وہ بوجھ ہٹادیا جو آپ

کی کمر دوہری کیے دے رہا تھا اور آپ کا ذکر بلند کیا۔ ان تینوں نعمتوں کے شکرانے کے طور پر یہ مطالبہ کیا گیا کہ فرائض سے فارغ ہو کر رب کی عبادت کی طرف راغب ہو جائیں۔

3. سورہ قریش میں اہلِ مکہ کو یاد دلایا گیا کہ اللہ ہی نے انہیں خوف کے مقابلے میں امن عطا کیا اور جاڑے اور گرمی کے سفروں کو ان کے لیے ذریعۂ رزق بنایا۔ اب اس احسانِ عظیم کا بدل یہ مانگا گیا کہ تمام باطل معبودوں کو چھوڑ کر صرف ربِ کعبہ کی ہی عبادت کی جائے۔
4. سورہ کوثر میں حوضِ کوثر اور لازوال نیک نامی کا شکرانہ نماز قائم کرنے اور قربانی پیش کرنے کو قرار دیا گیا۔
5. سورہ نصر میں فتح و نصرت اور دینِ اسلام کی اشاعت کا شکرانہ تسبیح، تحمید اور استغفار کو بتایا گیا۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا جواب زبانی تحمید، تسبیح، استغفار، تہلیل، نماز، قربانی، اور رب کی طرف سچی رغبت سے دیا جاتا ہے۔

## اسلامی تہوار اور شکر کا تصور

اسلام میں خوشی اور مسرت کے مواقع بھی شکرِ نعمت کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چنانچہ عید الفطر رمضان المبارک کی عبادتوں، روزوں اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت پر شکر ادا کرنے کا دن ہے، جبکہ عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بے مثال اطاعت، ایثار اور قربانی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اسی طرح یوم عاشوراء کا روزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات ملنے پر اللہ تعالیٰ کے شکر کی ایک عملی صورت ہے۔

ان مواقع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام نعمتوں اور کامیابیوں پر محض خوشی منانے یا جذباتی مسرت کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ذکرِ الٰہی، عبادت، انفاق، قربانی اور اطاعتِ رب کے ذریعے شکر گزاری کا عملی راستہ دکھاتا ہے۔ گویا ایک مسلمان کے لیے ہر نعمت، ہر کامیابی اور ہر خوشی کا حقیقی حسن اس میں ہے کہ وہ اسے اپنے رب کی طرف رجوع، اس کی حمد و ثنا اور اس کی فرمانبرداری کا ذریعہ بنائے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام خوشی، مسرت اور شکر گزاری کے جذبات کے اظہار کے لیے ایک پاکیزہ، متوازن اور بامقصد راستہ دکھاتا ہے۔ عبادت، ذکرِ الٰہی، صدقہ و خیرات، باہمی ملاقات اور جائز تفریح وہ ذرائع ہیں جنہیں اسلام نے پسند فرمایا ہے۔ اس کے برعکس ایسے تمام طریقے

جو اسراف، نمود و نمائش، ایذا رسانی یا فرائضِ دینی سے غفلت کا سبب بنیں، اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لہٰذا جلسہ جلوس، چراغاں، میلے ٹھیلے، شور و ہنگامہ، آتش بازی، نشہ آور سرگرمیاں، رات بھر لہو و لعب میں مشغول رہنا، فرائض سے بے پروائی برتنا، یا دوسروں کے آرام، سکون اور آمد و رفت میں خلل ڈالنا شکر گزاری کے مطلوب اسلامی تصور کی نمائندگی نہیں کرتے۔ ایک مسلمان کے لیے حقیقی خوشی اور کامل شکر یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو اس کی رضا، اطاعت اور بندگانِ خدا کی خیر خواہی کا ذریعہ بنائے۔

## شکرانِ نعمت کی عملی شکلیں

شکر صرف زبان سے چند کلمات ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل تعلق عمل سے ہے۔ زکوٰۃ اور انفاق بھی شکرِ نعمت کی عملی شکلیں ہیں۔ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ (البقرۃ 254)

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو ایسے اشخاص پر رشک کرنے کی ترغیب دی ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں (علمِ قرآن اور مال و دولت) کو دن رات بندگانِ خدا کی فلاح اور فیض رسانی پر خرچ کرتے ہیں۔ (بخاری 1409، مسلم 816) یہ دراصل نعمت کا بہترین تشکر ہے۔

قرآن کا علم اور مال و دولت دراصل وہ عظیم نعمتیں ہیں جن سے دین کے دو بڑے نظام (نظامِ ہدایت اور نظامِ کفالت) چلتے ہیں۔ علمِ قرآن کا عملی شکر یہ ہے کہ انسان دن رات بندگانِ خدا کو فکری و اخلاقی اندھیروں سے نکالے، اور مال کا شکر یہ ہے کہ اسے جمع کرنے کے بجائے صبح و شام ضرورت مندوں پر بہا دیا جائے۔ چونکہ ان دونوں نعمتوں کا اثر پذیری کا دائرہ پوری انسانیت پر محیط ہوتا ہے اور یہ دنیا و آخرت کے عروج کا بہترین امتزاج ہیں، اسی لیے امت میں علم کی ترویج اور انفاقِ مال کا جذبہ ابھارنے کے لیے انہیں قابلِ رشک قرار دیا گیا۔

قیامت کے دن ہر بندے سے "النعیم" (نعمتوں) کے بارے میں سوال ہوگا ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۔ (التکاثر 8)۔ اور کامیاب وہی ہوگا جو شکر گزار رہا۔

اگر ہم اپنے اوپر کی گئی بنیادی نعمتوں پر غور کریں تو ان کا شکرانہ ادا کرنے کی درج ذیل شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

1. والدین کی نعمت: والدین کی دیکھ بھال اور تربیت کا قرض اتارنا ممکن نہیں ہے۔ اس کا شکرانہ یہ ہے کہ ان کے سامنے "اُف" تک نہ کہا جائے (اسراء 23)، عاجزی سے جھکا جائے (اسراء

24)اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِی وَلِوَالِدَیَّ (ابراہیم 41)ان کے لئے دعا کی جائے کہ اللہ ان پر رحم فرمائے۔رَبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّیَانِی صَغِیرًا(اسراء24)

2. ہوا اور پانی کی نعمت: زندگی کے لیے سب سے ضروری ان دو مفت نعمتوں کا شکرانہ یہ ہے کہ ہم انہیں آلودہ نہ کریں، دوسروں کے لیے ان کا حصول مشکل نہ بنائیں اور پانی کو اسراف سے نہ بہائیں۔حدیث کے مطابق بہتی نہر کے کنارے بھی اسراف منع ہے۔(مسند احمد 7065)

3. اعضائے بدن کی نعمت: اللہ نے ہمارے اعضاء و جوارح کو صحیح و سالم بنایا ہے۔ان کا شکرانہ یہ ہے کہ آنکھوں سے صرف جائز دیکھیں، ہاتھوں سے دوسروں کی مدد کریں۔ ہمارے ہاتھ دوسروں پر ظلم کرنے والے نہ ہوں، اور پیروں سے صحیح راستوں پر چلیں۔ورنہ کل قیامت کے دن یہی اعضاء ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔(النور 24)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے شمار ایسی نعمتیں بن مانگے عطا کی ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔وَإِن تَعُدُّوا نِعۡمَةَ اللَّهِ لَا تُحۡصُوهَا (ابراہیم 34،النحل 18)

ہماری ذمہ داری ہے کہ اسی نہج پر غور وفکر کرتے ہوئے غفلت کی چادر کو اپنے اوپر سے ہٹائیں، اپنے گرد و پیش بکھری ربانی عنایات پر غور کریں اور اپنی پوری زندگی کو اللہ کی شکر گزاری، طاعت اور فرمانبرداری کے سانچے میں ڈھال لیں۔زبانی شکر کے ساتھ ساتھ اپنے عمل، اپنے اعضاء اور اپنے وسائل کو اللہ کی رضا میں کھپانا ہی دراصل بحیثیت مسلم ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔زندگی کا اصل حسن یہی ہے کہ اس کا ہر ہر لمحہ اللہ کی شکر گزاری، طاعت اور والہانہ فرمانبرداری کے سانچے میں ڈھل جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نعمتوں کی قدر دانی اور حقیقی شکر گزار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یارب العالمین!

☆☆☆

سروری بانو، سابق معلمہ، جامعۃ الفلاح نسواں

# ماہِ محرم الحرام: فضائل و برکات اور پیغامِ عاشورہ

**الحمد للہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین محمد، وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔**

اسلامی سال کا آغاز ماہِ محرم الحرام سے ہوتا ہے۔ یہ مہینہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت عظمت، فضیلت اور احترام کا حامل ہے۔ قرآنِ کریم میں جن چار مہینوں کو اشہرِ حرم یعنی حرمت والے مہینے قرار دیا گیا ہے، ان میں محرم الحرام بھی شامل ہے۔ اس مہینے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے "شہرُ اللہ" یعنی اللہ کا مہینہ قرار دیا ہے۔ یہ مہینہ مسلمانوں کو تقویٰ، صبر، عبادت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا درس دیتا ہے۔

محرم الحرام کی فضیلت کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"رمضان کے بعد سب سے افضل روزے اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔"

(أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللّٰهِ الْمُحَرَّمُ) (مسلم)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم الحرام میں نفلی عبادات، خصوصاً روزوں کا اہتمام، باعثِ اجر و ثواب ہے۔ اس بابرکت مہینے میں نیک اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

محرم الحرام کی سب سے نمایاں تاریخ دس محرم، یعنی یومِ عاشورہ، ہے۔ یہ دن تاریخِ اسلام اور تاریخِ انبیاء میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات عطا فرمائی تھی۔

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہودیوں کو عاشورہ کا روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ نجات کا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے

حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات عطا فرمائی تھی، اس لیے وہ شکرانے کے طور پر اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"نَحْنُ أَحَقُّ بِمُوسَى مِنْكُمْ" (ہم تمہاری نسبت حضرت موسیٰ کے زیادہ حق دار ہیں۔)

یعنی ہم حضرت موسیٰ کی نبوت پر ایمان رکھنے اور ان کی تعلیمات سے تعلق رکھنے کے اعتبار سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود بھی عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابۂ کرامؓ کو بھی اس کی ترغیب دی۔

عاشورہ کے روزے کی ایک بڑی فضیلت یہ بھی ہے کہ یہ گزشتہ ایک سال کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ عاشورہ کا روزہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔" (مسلم)

اسی لیے مسلمان اس دن روزہ رکھنے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ سنتِ نبویؐ کے مطابق صرف دسویں محرم کا روزہ رکھنے کے بجائے نویں اور دسویں، یا دسویں اور گیارہویں محرم کے روزے رکھنا بہتر ہے، تاکہ مسلمانوں کی عبادت ممتاز رہے اور سنت کی پیروی کا زیادہ اہتمام ہو۔

ماہِ محرم ہمیں قربانی، صبر اور استقامت کا عظیم درس بھی دیتا ہے۔ اسی مہینے میں نواسۂ رسول ﷺ حضرت حسینؓ اور ان کے اہلِ خانہ و جاں نثار ساتھیوں نے میدانِ کربلا میں حق و صداقت کی خاطر عظیم قربانیاں پیش کیں۔ انہوں نے ظلم، جبر اور باطل کے سامنے سر جھکانے کے بجائے دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ واقعۂ کربلا ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں حق کا ساتھ دینا چاہیے، خواہ اس کے لیے کتنی ہی مشکلات، مصائب اور قربانیاں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔

تاہم یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ محرم الحرام کا احترام شریعتِ اسلامیہ کے احکام اور سنتِ نبویؐ کے مطابق ہونا چاہیے۔ اسلام صبر، اعتدال اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے ایسے تمام اعمال اور رسومات سے اجتناب کرنا چاہیے جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں یا جو محرم کے حقیقی پیغام سے ہٹا کر محض رسم و رواج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ خود کو نقصان پہنچانے اور ایسے تمام مظاہر سے بچنا چاہیے جو اس مقدس مہینے کے وقار کے خلاف ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے مصیبت

کے وقت صبر اختیار کرنے اور اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔

لہٰذا واقعۂ کربلا سے صحیح سبق یہی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں صبر، تقویٰ، حق گوئی اور دین پر استقامت کو اختیار کریں۔

آج کے دور میں، جب امتِ مسلمہ مختلف چیلنجز کا سامنا کر رہی ہے، محرم الحرام اور یومِ عاشورہ کا پیغام پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ مہینہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرنے، عبادات میں اضافہ کرنے، گناہوں سے توبہ کرنے اور معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماہِ محرم الحرام برکتوں، رحمتوں اور عظیم اسباق کا مہینہ ہے۔ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی نصرت، انبیاء کرامؑ کی جدوجہد، حضرت حسینؓ کی عظیم قربانی، صبر، شکرگزاری، عبادت اور حق پر استقامت کا درس دیتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس بابرکت مہینے میں سنتِ نبویؐ کے مطابق روزوں، عبادت اور نیک اعمال کا اہتمام کریں اور اپنی زندگیوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماہِ محرم الحرام کی برکتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے، عاشورہ کے روزے رکھنے اور اس کے عظیم پیغام کو اپنی زندگیوں میں اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین۔

وما علینا إلا البلاغ المبین۔

☆☆☆

یاسر انعام فلاحی

# اسلامی نیا سال: ماضی کا احتساب اور مستقبل کا لائحہ عمل

اسلامی ہجری سال 1447 رخصت ہو چکا ہے اور نئے ہجری سال 1448 کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہجری سن کی ابتدا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے ہوتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ہجرت ایک عظیم واقعہ ہے جس نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔

واقعۂ ہجرت محض نقلِ مکانی نہ تھا بلکہ ایک عظیم انقلاب کا نقطۂ آغاز تھا۔ یہ ظلم و جور سے نکل کر عدل وانصاف کی طرف سفر تھا اور ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت تھی جہاں اسلام کے پیغام کو عملی زندگی میں نافذ کیا جا سکے۔ یہ ہجرت حکمِ الٰہی کی تعمیل تھی۔

اسلامی نیا سال ہمیں صرف ایک نئے سال کے آغاز کا احساس نہیں دلاتا بلکہ یہ اپنے ماضی کا جائزہ لینے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اقدار کی تعلیم دی، ہم نے انہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کس حد تک اپنایا؟ کیا ہم نے صبر، قربانی، اخوت، دیانت اور اللہ پر توکل کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا، یا انہیں صرف تاریخ کے ایک روشن باب تک محدود کر دیا؟ یہی حقیقی احتساب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ) سورۃ النحل:41

(جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے، ہم انہیں دنیا ہی میں بہترین ٹھکانہ عطا کریں گے، اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑا ہے، کاش وہ جانتے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا:

(إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ

يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ) سورۃ البقرہ:218

(جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جدو جہد کی، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔)

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں راہِ خدا میں آنے والی آزمائشوں پر صبر، استقامت اور قربانی کا عظیم درس دیتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ کی رضا کے لیے اپنے گھروں، وطن اور عزیز و اقارب کو چھوڑا۔ یہ تاریخِ انسانی کی عظیم ترین قربانیوں میں سے ایک ہے۔

ہجرت کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ کی قسم! تم اللہ کی بہترین زمین ہو اور میرے نزدیک بھی سب سے زیادہ محبوب ہو۔ اگر تمہارے لوگوں نے مجھے یہاں سے نہ نکالا ہوتا تو میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہ جاتا۔" (سنن ابن ماجہ: 3108)

مکہ مکرمہ میں پیش آنے والی آزمائشوں کے بعد پہلے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت ہوئی۔ اس واقعے میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ مشکلات اور ناموافق حالات میں مایوسی کے بجائے اخلاص، صبر اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔

واقعۂ ہجرت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل تیاری اور بہترین منصوبہ بندی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مادی وسائل اختیار کیے، سفر کا وقت حکمت کے ساتھ منتخب فرمایا، راستہ تبدیل کیا، غارِ ثور میں قیام فرمایا اور مختلف افراد کو مختلف ذمہ داریاں سونپیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ) سورۃ الانفال:60

(اور ان کے مقابلے کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے، قوت تیار رکھو۔)

آج ہمیں اس پہلو کا بھی احتساب کرنا چاہیے کہ ہماری بہت سی کمزوریوں کی ایک وجہ منصوبہ بندی، نظم وضبط اور مسلسل جدو جہد کا فقدان بھی ہے۔ ہم کامیابی چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری تیاری اور محنت پر ہمیشہ پوری توجہ نہیں دیتے۔

غارِ ثور کا واقعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ تمام اسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر کامل

اعتماد رکھنا چاہیے۔ اسی موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

(لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا) سورۃ التوبہ:40

غم نہ کیجیے، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

ہجرتِ مدینہ ایک نئی صبح کی نوید تھی۔ اس کامیابی کے پیچھے اللہ پر کامل اعتماد، اخلاص، بہترین منصوبہ بندی، وسائل کا درست استعمال اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بے مثال محبت و وفاداری شامل تھی۔ مدینہ منورہ پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت کا عظیم رشتہ قائم فرمایا، جو محبت، ایثار اور قربانی کی بے مثال مثال ہے۔

نئے ہجری سال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہجرت کے پیغام کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔ ہمارا لائحۂ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم غفلت سے بیداری، مایوسی سے امید، جہالت سے علم اور برائی سے نیکی کی طرف ہجرت کریں۔ ہم قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں جگہ دیں، علم حاصل کریں، اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنائیں اور معاشرے کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کریں۔

اجتماعی زندگی میں ہمیں مدینہ منورہ کے معاشرے سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جہاں اخوت، ایثار اور باہمی تعاون کی بنیاد پر ایک مضبوط معاشرہ قائم ہوا۔ ہمیں اختلافات کم کرنے، اتحاد و اتفاق کو فروغ دینے اور عدل و خیر خواہی کے قیام کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ہم ہجرت کے حقیقی پیغام کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مثبت تبدیلی لانے کی کوشش کریں تو نیا ہجری سال ہمارے لیے محض کیلنڈر کی تبدیلی نہیں بلکہ فکر، عمل اور کردار کی تبدیلی کا آغاز بن سکتا ہے۔

☆☆☆

سید اسد اللہ کاظمی

# ہجرتِ مدینہ اور عالمگیر اسلامی تحریک کا عروج

سیرتِ طیبہ کا ہر واقعہ ہمارے لیے اسوہ اور مشعلِ راہ ہے، لیکن بعض واقعات ایسے ہیں جنھوں نے اسلامی تحریک کی سمت کو بدل دیا اور جن کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ انھی عظیم واقعات میں ہجرتِ مدینہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

ہجرتِ مدینہ اسلامی تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا نام نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی جدوجہد کا آغاز تھا جس کے ذریعے اسلامی معاشرہ قائم ہوا اور اسلام کی دعوت کو وسعت ملی۔

ہجرتِ مدینہ کے بے شمار نتائج اور ثمرات ہیں، تاہم یہاں چند اہم پہلوؤں کا ذکر کیا جارہا ہے جن کے ذریعے اسلامی تحریک کو عروج اور استحکام حاصل ہوا۔

## کامل یکسوئی

ہجرتِ مدینہ کا پہلا اہم نتیجہ یہ تھا کہ اہلِ ایمان کو اپنے مقصد کے لیے مکمل یکسوئی حاصل ہوگئی۔ مکہ مکرمہ کے دور میں مسلمانوں کی بنیادی تربیت ہوچکی تھی۔ انھیں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد پر مضبوط کر دیا گیا تھا۔ قرآن مجید کی تعلیمات نے ان کے ایمان، کردار اور ارادوں کو مضبوط بنایا، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکی تھی۔

قریش کے ظلم و ستم اور سخت آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں نے صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اب ضرورت تھی کہ ان تعلیمات کو عملی زندگی میں نافذ کیا جائے اور ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جائے جو اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ کی رضا کے لیے اپنے گھر، مال و دولت، عزیز و اقارب اور محبوب وطن مکہ مکرمہ تک کو چھوڑ دیا۔ قرآن مجید نے ان کی اس قربانی کو سراہتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ البقرہ:218

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جدوجہد کی، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔)

اس عظیم قربانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے راستے کی بہت سی رکاوٹیں دور ہو گئیں اور مدینہ منورہ میں وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اسلامی معاشرے کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

## اسلامی معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مسلمانوں کو ایک نئے معاشرے کی تعمیر کا موقع ملا۔ انصارِ مدینہ نے مہاجرین کو دینی رشتے کی بنیاد پر قبول کیا اور اپنی محبت، ایثار اور قربانی سے تاریخ میں ایک روشن مثال قائم کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات کا عظیم رشتہ قائم فرمایا۔ اس کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان ایسا بھائی چارہ پیدا ہوا جس میں نسل، قبیلہ اور علاقے کی تمام تفریق ختم ہو گئی۔

انصارِ مدینہ نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ جس محبت اور خلوص کا معاملہ کیا، وہ بے مثال تھا۔ انہوں نے اپنے گھروں، مال اور وسائل میں مہاجرین کو شریک کیا اور انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ قرآن مجید نے بھی انصار کی اس صفت کو بیان فرمایا کہ وہ خود ضرورت مند ہونے کے باوجود اپنے بھائیوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔

مؤاخات کی ایک مثال حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان قائم ہونے والے رشتے کی ہے۔ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے اپنے مہاجر بھائی کے ساتھ ایسا تعاون پیش کیا جو انصار کے جذبۂ ایثار کی علامت تھا۔ انہوں نے اپنے مال میں شرکت کی پیشکش کی، لیکن حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خود محنت اور تجارت کو ترجیح دی اور فرمایا کہ مجھے بازار کا راستہ بتا دیجیے۔

اسی طرح بہت سے انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں جگہ دی، ان کے ساتھ کھانے پینے اور زندگی کے معاملات میں شریک ہوئے۔ یہ اخوت صرف زبانی تعلق نہیں تھا بلکہ عملی محبت، تعاون اور قربانی کا نام تھا۔

اس مؤاخات کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا ہوا، قبائلی عصبیت کم ہوئی اور ایمان، اخوت اور باہمی تعاون پر قائم ایک مضبوط معاشرہ وجود میں آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں مختلف قبائل کے ساتھ معاہدے کیے اور ایک منظم اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، جہاں زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے رہنمائی فراہم کی گئی۔

## فتوحات کا تسلسل اور عالمگیر دعوت کا آغاز

ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں کو مختلف چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ کفارِ مکہ کی دشمنی، بعض قبائل کی مخالفت اور اندرونی سازشوں کے باوجود مسلمانوں نے صبر، حکمت اور ثابت قدمی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔

مختلف مواقع پر حاصل ہونے والی کامیابیوں نے نہ صرف مسلمانوں کو مضبوط کیا بلکہ اسلام کی دعوت کے پھیلاؤ کے مواقع بھی پیدا کیے۔ اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہوا اور عرب کے مختلف قبائل اسلام سے متعارف ہوئے۔

مدینہ منورہ کی یہ ریاست آگے چل کر عالمگیر اسلامی دعوت کا مرکز بنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل اور علاقوں کی طرف دعوتی پیغامات بھیجے اور وقت کے حکمرانوں تک بھی اسلام کا پیغام پہنچایا۔ اس طرح ہجرتِ مدینہ ایک مقامی جدوجہد سے بڑھ کر ایک عالمی دعوت کی بنیاد بن گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ النور:55

ہجرتِ مدینہ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ کامیابی صرف خواہشات سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ مضبوط ایمان، قربانی، صحیح منصوبہ بندی، اتحاد اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

ہجرتِ مدینہ نے پہلے ایک صالح معاشرہ قائم کیا، پھر ایک مضبوط ریاست کی بنیاد رکھی اور بالآخر ایک ایسی عالمگیر دعوت کی شکل اختیار کی جس نے دنیا کے مختلف خطوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔

آج بھی ہجرت کا پیغام یہی ہے کہ امت ایمان، عمل، اتحاد اور حکمت کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرے، کیونکہ یہی وہ اصول ہیں جنہوں نے ماضی میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا تھا۔

☆☆☆

بلال احمد فلاحی

# پیغامِ ہجرت اور عصرِ حاضر کا مسلم بحران

اسلامی تاریخ میں ہجرت کا واقعہ محض ایک تاریخی موڑ یا جغرافیائی نقل مکانی کا نام نہیں، بلکہ یہ اسلام کے فکری، تہذیبی اور اجتماعی مزاج کو سمجھنے اور عصرِ حاضر کے مسلم بحران کا تجزیہ کرنے کی ایک بنیادی کلید ہے۔

ہجرتِ نبوی ﷺ نے واضح کیا کہ مسلمان کی اصل وابستگی زمین، نسل، قبیلے یا دنیاوی مفادات سے نہیں، بلکہ ایمان، حق، عدل اور اللہ کی بندگی سے ہے۔ اسی لیے ہجرت کو صرف ماضی کے ایک واقعے کے طور پر پڑھنا اس کے اصل پیغام کو محدود کر دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت ایک زندہ ایمانی و تہذیبی اصول ہے جو ہر دور میں مسلمانوں کو یہ سبق دیتی ہے کہ جب دین، شناخت اور اخلاقی وجود خطرے میں ہوں تو محض بقا کافی نہیں، بلکہ صحیح سمت میں بقا مطلوب ہے۔

معاصر دنیا میں امتِ مسلمہ کو کئی مسائل کا سامنا ہے، لیکن ان میں دو بحران نمایاں ہیں: ایک جغرافیائی بحران جس میں مسلمان اپنے وطن، وسائل اور اجتماعی اختیار سے محروم ہو رہے ہیں، اور دوسرا فکری بحران جس میں وہ اپنی تہذیبی خود اعتمادی، علمی مرکزیت اور دینی شعور کھوتے جا رہے ہیں۔ ایسے حالات میں پیغامِ ہجرت محض ایک تاریخی یاد نہیں بلکہ ایک اہم فکری رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

## ہجرت کا قرآنی و نبوی مفہوم

قرآنِ مجید نے ہجرت کو صرف ایک سفر نہیں بلکہ ایمان، دین کے تحفظ اور اجتماعی ذمہ داری سے جوڑا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا۔

(النساء:97)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اگر کوئی ماحول انسان کے دینی وجود کے لیے نقصان دہ ہو اور

وہاں سے نکلنے کی استطاعت بھی موجود ہو تو محض مجبوری کا دعویٰ کافی نہیں۔ البتہ جو لوگ حقیقی طور پر بے بس ہوں، ان کے لیے عذر کا پہلو موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے وسیع مفہوم کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ" (متفق علیہ)

یعنی حقیقی مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت صرف مکہ سے مدینہ تک محدود نہیں بلکہ ہر دور میں گناہ سے اطاعت، غفلت سے شعور اور باطل سے حق کی طرف سفر کا نام بھی ہے۔

## ہجرت: جغرافیائی نقل مکانی سے بڑھ کر ایک تہذیبی اقدام

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد صرف ظلم سے نجات حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ ایک ایسی اجتماعی زندگی کی بنیاد رکھنا تھا جس میں ایمان، قانون، اخوت، عدل اور اخلاق کو عملی صورت دی جا سکے۔ مدینہ کی طرف ہجرت نے مسلمانوں کو محض تحفظ نہیں دیا بلکہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر کا موقع فراہم کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ہجرت محض منفی ردِعمل نہیں بلکہ تعمیری حکمتِ عملی بھی ہے۔ جب کوئی ماحول دین کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے میں رکاوٹ بن جائے تو مسلمان صرف شکایت نہیں کرتا بلکہ بہتر فضا کی تعمیر اور تلاش کی کوشش کرتا ہے۔

## معاصر دنیا میں مسلمانوں کا جغرافیائی بحران

آج مسلمانوں کا جغرافیائی بحران کئی شکلوں میں سامنے آتا ہے۔ فلسطین، شام، برما، سوڈان، کشمیر اور دیگر خطوں میں جنگ، قبضے، جبری نقل مکانی اور سیاسی بے دخلی کے مسائل موجود ہیں۔ لاکھوں افراد اپنے گھروں، وسائل اور تحفظ سے محروم ہیں۔ یہ صرف انسانی المیہ نہیں بلکہ امت کی اجتماعی کمزوری کا اظہار بھی ہے۔

جغرافیائی بحران کی ایک دوسری صورت یہ ہے کہ زمین تو موجود ہے، لیکن اجتماعی اختیار کمزور ہو گیا ہے۔ بہت سے مسلم معاشروں میں تعلیمی، معاشی، قانونی اور ثقافتی سمت بڑی حد تک بیرونی تصورات سے متاثر ہے۔ اس لیے مسئلہ صرف سرزمین کا نہیں بلکہ تہذیبی خودمختاری کا بھی ہے۔

## فکری بحران: معاصر عہد کا بڑا مسئلہ

اگر جغرافیائی بحران امت کے جسم پر زخم ہے تو فکری بحران اس کے شعور کو متاثر کرنے والا مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنی دینی روایت، علمی سرمایہ اور تہذیبی شناخت کے بارے میں اعتماد کھوتا جا رہا ہے۔

یہ بحران چند صورتوں میں نمایاں ہے:

**دین کو محدود تصور کرنا:**

بعض جدید رجحانات دین کو صرف چند عبادات اور ذاتی زندگی تک محدود کرنا چاہتے ہیں، جس کے نتیجے میں اجتماعی زندگی، اخلاق، خاندان اور معاشرتی نظام میں دین کی رہنمائی کمزور پڑ جاتی ہے۔

**تہذیبی مرعوبیت:**

ترقی، عقلانیت اور انسانیت کے تصورات دوسروں سے مستعار لینے کی وجہ سے بعض مسلمان اپنی علمی روایت، اخلاقی اصولوں اور تہذیبی اقدار کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔

**علمی روایت سے دوری:**

قرآن، حدیث، سیرت اور اسلامی تاریخ سے کمزور تعلق کی وجہ سے نئی نسل سطحی معلومات اور غیر متوازن فکری رجحانات کا شکار ہو جاتی ہے۔

پیغامِ ہجرت: معاصر بحرانوں کے لیے رہنمائی

ہجرت ہمیں چند بنیادی اصول فراہم کرتی ہے:

**اول: ایمان اور دینی شناخت کا تحفظ**

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا سبق یہ ہے کہ مسلمان کی سب سے بڑی ترجیح اپنے ایمان اور دینی شناخت کی حفاظت ہے۔

**دوم: باطل ماحول سے فاصلہ**

ہجرت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ انسان ایسے افکار، عادات اور ماحول سے دوری اختیار کرے جو اس کے دینی وجود کو کمزور کرتے ہیں۔ یہ ہجرت ہمیشہ جغرافیائی نہیں ہوتی بلکہ فکری اور اخلاقی بھی ہو سکتی ہے۔

**سوم: صرف ترک نہیں بلکہ تعمیر**

مدینہ کی تعمیر یہ سبق دیتی ہے کہ ہجرت محض کسی چیز کو چھوڑنے کا نام نہیں، بلکہ بہتر متبادل قائم کرنے کا نام

بھی ہے۔ امت کو تعلیم، میڈیا، خاندان اور سماجی اداروں میں ایسے نمونے پیدا کرنے ہوں گے جو ایمان، علم اور عصرِ حاضر کی بصیرت کو یکجا کریں۔

## چہارم: فرد اور امت دونوں کی اصلاح

انسان اپنے اندر موجود دنیا پرستی، فکری سستی اور اخلاقی کمزوریوں سے ہجرت کیے بغیر اجتماعی اصلاح میں مؤثر کردار ادا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح امت علمی مراکز، فکری قیادت اور تہذیبی اعتماد کی بحالی کے بغیر اپنے بحرانوں سے نہیں نکل سکتی۔

## موجودہ دور کے عملی تقاضے

پیغامِ ہجرت کو زندہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ:

- قرآن و سنت کی روشنی میں ایسی تعلیم کو فروغ دیا جائے جو عصرِ حاضر کے فکری سوالات کا جواب دے سکے۔
- اسلامی علمی روایت سے زندہ تعلق قائم کیا جائے۔
- تہذیبی خوداعتمادی پیدا کی جائے اور اپنی اقدار کو حکمت کے ساتھ پیش کیا جائے۔
- تعلیم، میڈیا اور سماجی میدان میں مثبت متبادل ادارے قائم کیے جائیں۔
- دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے مسائل سے جذباتی نہیں بلکہ علمی، رفاہی اور عملی تعلق قائم کیا جائے۔

آخرکار پیغامِ ہجرت کا اصل سبق یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین، فکر اور اجتماعی وجود کو حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ ہجرت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ نجات صرف جگہ بدلنے میں نہیں بلکہ مرکزِ وفا کی درستگی، فکری تطہیر، دینی استقامت اور صالح اجتماعی تعمیر میں ہے۔

معاصر دنیا میں مسلمانوں کا بحران صرف زمین کا بحران نہیں بلکہ معنی، شناخت اور تہذیبی خوداعتمادی کا بحران بھی ہے۔ ایسے میں ہجرت کا پیغام مسلمانوں کو اپنے ایمان، فکر اور کردار کی تجدید کی دعوت دیتا ہے۔ یہی ہجرت کا زندہ سبق ہے اور یہی موجودہ دور کے فکری و جغرافیائی بحرانوں کا مؤثر جواب بھی۔

☆☆☆

فیاض احمد فلاحی مدنی (قطر)

# اسوۂ حسینؓ اور باطل کے سامنے فکری و عملی استقامت

معرکۂ کربلا، اقامتِ دین، عدل کے قیام اور جابر نظام کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا پیغام

تاریخِ اسلام میں بعض شخصیات ایسی ہیں جن کی زندگیاں آنے والی نسلوں کے لیے فکر، کردار اور عمل کا سرچشمہ بن جاتی ہیں۔ نواسۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت حسن بن علیؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کا شمار انہی عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے کردار سے یہ واضح کیا کہ دین کی سربلندی، حق کی پاسداری اور امت کی خیر خواہی کے لیے حکمت، صبر، ایثار اور استقامت اختیار کرنا اہلِ ایمان کا شیوہ ہے۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی زندگیاں ایک ہی مقصد کے دو مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ حضرت حسنؓ نے امت کے اتحاد، مسلمانوں کے خون کی حفاظت اور اجتماعی مصلحت کے پیشِ نظر صلح کا راستہ اختیار کیا، جبکہ حضرت حسینؓ نے جب محسوس کیا کہ اسلامی نظام کے بنیادی اصول متاثر ہونے کا خطرہ ہے تو ظلم و جبر کے سامنے جھکنے کے بجائے استقامت کا راستہ اپنایا اور اپنی جان، اہلِ خانہ اور رفقا کی عظیم قربانی پیش کر دی۔

یہی اسوۂ حسنینؓ کی روح ہے کہ حالات کے تقاضے مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن مقصد ہمیشہ اللہ کی رضا، دین کی حفاظت اور امت کی خیر خواہی ہوتا ہے۔

## کربلا کا پس منظر اور حضرت حسینؓ کا موقف

معرکۂ کربلا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے اس کے تاریخی، سیاسی اور دینی پس منظر میں دیکھا جائے۔ حضرت حسینؓ کا اقدام کسی ذاتی اقتدار یا دنیاوی منصب کے حصول کے لیے نہیں تھا، بلکہ وہ

ان اصولوں کے تحفظ کے لیے کھڑے ہوئے جنہیں وہ اسلامی نظامِ زندگی کی بنیاد سمجھتے تھے۔

اسلامی سیاسی فکر میں عدل، شوریٰ، جواب دہی اور امت کی مصلحت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت حسینؓ کے نزدیک حکومت محض اقتدار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک دینی ذمہ داری تھی، جس کا مقصد عدل قائم کرنا اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔

جب انہیں محسوس ہوا کہ حکمرانی کا انداز ایسے رخ کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں موروثی اقتدار اور جبر کا عنصر غالب آ سکتا ہے تو انہوں نے اسے ایک اصولی مسئلہ سمجھا۔ ان کا موقف کسی ذاتی مخالفت یا شخصی نزاع پر مبنی نہیں تھا، بلکہ اصلاحِ امت اور دینی ذمہ داری کے احساس سے پیدا ہوا تھا۔

اسی جذبے کے تحت انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا موقف اختیار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر"**

یعنی سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا ہے۔

حضرت حسینؓ نے اپنے عمل سے واضح کیا کہ حق کی حمایت کبھی بڑی آزمائش کا تقاضا کرتی ہے، لیکن اہلِ حق مقصد کی عظمت کے سامنے ہر قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں۔

## حضرت حسنؓ کا اسوہ: صلح، حکمت اور امت کی وحدت

حضرت حسن بن علیؓ کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ استقامت صرف میدانِ مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کا نام نہیں، بلکہ امت کے وسیع تر مفاد کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جانا بھی عظیم کردار ہے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے، لیکن دوسری جانب شام میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ اختلاف موجود تھا۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ اگر جنگ کا راستہ اختیار کیا جاتا تو مسلمانوں کے درمیان شدید خونریزی کا خطرہ تھا۔

ایسے نازک وقت میں حضرت حسنؓ نے ذاتی حق اور منصب کے مقابلے میں امت کے اتحاد اور مسلمانوں کے خون کی حرمت کو ترجیح دی۔ آپؓ نے صلح کا راستہ اختیار کیا۔ یہ فیصلہ کمزوری یا خوف کی علامت نہیں بلکہ دور اندیشی، حکمت اور امت کی خیر خواہی کا مظہر تھا۔

حضرت حسنؓ بہادری اور شجاعت میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ آپؓ حضرت علیؓ کے فرزند تھے اور مشکل حالات میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر چکے تھے، لیکن آپؓ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی وحدت اور ان کی جانوں کا تحفظ سیاسی حق سے زیادہ اہم ہے۔

اسی عظیم کردار کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا: **إِنَّ ابني هذا سَيِّدٌ، ولَعَلَّ اللهَ أن يُصلِحَ به بينَ فِئَتَينِ عَظيمَتَينِ مِنَ المُسلِمينَ.** صحیح بخاری (میرا یہ بیٹا سردار ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔) 41 ہجری میں اسی واقعے کے بعد مسلمانوں کے اجتماع اور اتحاد کی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی وجہ سے یہ سال عام الجماعت کے نام سے معروف ہوا۔

## حضرت حسینؓ کا اسوہ: حق پر استقامت اور باطل کے سامنے انکار

حضرت حسنؓ کے دور میں جس حکمت اور مصلحت کا تقاضا تھا، حالات بدلنے کے بعد حضرت حسینؓ کے سامنے ایک مختلف نوعیت کا مسئلہ تھا۔

یزید کی ولی عہدی اور پھر اقتدار سنبھالنے کے بعد حکومت کا معاملہ موروثی طرزِ حکمرانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حضرت حسینؓ کے نزدیک یہ محض ایک حکمران کا معاملہ نہیں بلکہ اسلامی نظامِ حکومت کے اصولوں کا مسئلہ تھا۔

اسی بنا پر آپؓ نے بیعت کرنے سے انکار کیا۔ یہ انکار کسی ذاتی دشمنی یا اقتدار کی خواہش پر مبنی نہیں تھا بلکہ ایک اصولی موقف تھا۔ آپؓ اصلاحِ امت، حق کی سربلندی اور دینی اقدار کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوئے۔

کربلا کے میدان میں حالات انتہائی سخت تھے۔ بھوک، پیاس، اہلِ خانہ اور ساتھیوں کی قربانی جیسے امتحانات کے باوجود حضرت حسینؓ نے ظلم و جبر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ آپؓ کی قربانی نے تاریخِ اسلام میں یہ مثال قائم کی کہ حق کے لیے ثابت قدمی بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔

## اسوۂ حسنینؓ کا پیغام

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب نواسے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان دونوں عظیم فرزندوں سے بے پناہ محبت تھی۔ احادیثِ مبارکہ میں ان کے مقام و مرتبے کا ذکر ملتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَن أحَبَّ الحَسَنَ والحُسينَ فقد أحَبَّني ومَن أبغَضَهما فقد أبْغَضَني" (جس نے حسن اور حسین سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی، اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا۔)(سنن النسائی/ابو ہریرہ)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حسن اور حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی زندگیاں ہمیں یہ سمجھاتی ہیں کہ دین کے لیے کردار کا تقاضا حالات کے مطابق بدل سکتا ہے۔ کبھی اتحاد اور امن کے لیے صبر و حکمت اختیار کرنا پڑتی ہے اور کبھی اصولوں کی حفاظت کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے۔

آج بھی امت کو فکری، تہذیبی اور اخلاقی چیلنجز کا سامنا ہے۔ باطل صرف طاقت کے ذریعے نہیں آتا بلکہ نظریات، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اسوۂ حسنینؓ رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ اہلِ ایمان علم، حکمت، کردار اور استقامت کے ساتھ حق کی حفاظت کریں۔

حضرت حسنؓ کا کردار اتحاد، برداشت اور اجتماعی مصلحت کی اہمیت واضح کرتا ہے، جبکہ حضرت حسینؓ کی قربانی ظلم و ناانصافی کے مقابلے میں حق بات کہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی زندگیاں امت کے لیے یہ پیغام ہیں کہ حق کی سربلندی صبر، قربانی اور اخلاص کے بغیر ممکن نہیں۔ کبھی امت کو جوڑنے کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور کبھی اصولوں کی حفاظت کے لیے جان تک پیش کرنی پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت حسنؓ کی حکمت، حضرت حسینؓ کی استقامت، حق کی پہچان اور دین کی سربلندی کے لیے اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

☆☆☆

سید مطیع الرحمٰن حنیف فلاحی

# محرم الحرام کا پیغام: اتحادِ امت اور باہمی احترام کی ضرورت

اسلامی سال کا آغاز ماہِ محرم الحرام سے ہوتا ہے۔ یہ مہینہ محض سال کی تبدیلی کا نام نہیں، بلکہ اپنے اندر عظیم روحانی، اخلاقی اور تاریخی پیغامات رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جن چار مہینوں کو حرمت والا قرار دیا ہے، ان میں محرم الحرام بھی شامل ہے۔ یہ مہینہ ہمیں تقویٰ، صبر، اصلاحِ نفس اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

محرم کا ایک اہم پیغام یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے باہمی تعلقات کو مضبوط کریں، اختلافات کو دشمنی میں تبدیل نہ کریں اور امت کی وحدت کو اہمیت دیں۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا) (آل عمران:103)

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

اسلام نے مسلمانوں کو اخوت، محبت اور باہمی خیر خواہی کا درس دیا ہے۔ اختلافِ رائے انسانی فطرت کا حصہ ہے، لیکن اختلاف کو نفرت، تحقیر اور دشمنی کا ذریعہ بنانا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ امت کے مختلف مکاتبِ فکر میں بعض علمی اور فقہی اختلافات موجود رہے ہیں، مگر اس کے باوجود اہلِ علم نے ہمیشہ ادب، احترام اور حسنِ تعلق کو ملحوظ رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ مبارکہ میں اتحادِ امت کے روشن نمونے ملتے ہیں۔ مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم فرمائی، جس نے محبت، ایثار اور قربانی کی عظیم مثال قائم کی۔ اسی طرح میثاقِ مدینہ کے ذریعے مختلف طبقات کے درمیان امن، انصاف اور باہمی ذمہ داری کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط معاشرہ باہمی اعتماد، عدل اور خیر خواہی سے وجود میں آتا ہے۔

محرم الحرام ہمیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی کی یاد بھی دلاتا ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فرزند اور اہلِ بیتِ نبوی کے عظیم فرد ہیں۔ واقعۂ کربلا ہمیں حق، عدل، صبر اور ظلم کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کا سبق دیتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی اور قربانی کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان حالات جیسے بھی ہوں، حق اور اصولوں کا ساتھ نہ چھوڑے۔

اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی بھی امت کے لیے ایک عظیم سبق رکھتی ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے درمیان خونریزی کو روکنے اور اتحاد قائم رکھنے کے لیے صلح کا راستہ اختیار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حکمت، مصلحت، صبر اور امت کی خیر خواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سے محبت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام دونوں دین کے اہم تقاضے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کی مختلف روشنیاں ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کی تعلیمات یعنی حق پسندی، صبر، تقویٰ اور ظلم سے نفرت کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔

بدقسمتی سے بعض اوقات محرم کے موقع پر ایسی گفتگو اور سرگرمیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جو اصلاح اور عبرت کے بجائے نفرت اور اختلاف کو بڑھاتی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس مہینے کے اصل پیغام کو سمجھیں، غیر ضروری بحثوں، اشتعال انگیز گفتگو اور ایسے اعمال سے بچیں جو امت کے درمیان دوری پیدا کریں۔ محرم کا تقاضا یہ ہے کہ دلوں میں محبت، زبانوں میں خیر اور اعمال میں تقویٰ پیدا ہو۔

آج کے دور میں امتِ مسلمہ کو بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے۔ ایسے حالات میں باہمی اختلافات کو بڑھانے کے بجائے مشترکات پر جمع ہونے کی ضرورت ہے۔ قرآن، سنت، نماز، روزہ، حج، اخلاق، اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی محبت اور امت کی خیر خواہی وہ مشترک بنیادیں ہیں جو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہیں۔

سوشل میڈیا کے دور میں یہ ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے کہ ہم بغیر تحقیق کے کوئی بات آگے نہ بڑھائیں، کسی کے مقدسات کی توہین نہ کریں اور اختلاف کے باوجود انصاف اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

محرم الحرام ہمیں تین بنیادی پیغامات دیتا ہے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت، حق پر استقامت اور امت کے اتحاد کی کوشش۔ اگر مسلمان اس مہینے کے حقیقی پیغام کو سمجھیں اور اپنی زندگیوں میں نافذ کریں تو معاشرے میں امن، محبت اور خیر خواہی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن وسنت کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سے محبت، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام، اختلاف میں ادب اور پوری امت کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد ضیاء القمر فلاحی

# نئے سال کا عزم: عصرِ حاضر میں اقامتِ دین کی جدوجہد

وقت ایک سیلِ رواں ہے جو ہر لمحہ نئی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔ نئے سال کی آمد محض تقویم کے بدلنے کا نام نہیں، بلکہ ایک صاحبِ ایمان کے لیے احتسابِ ماضی، تجدیدِ عہد اور عزمِ مستقبل کا موقع ہے۔ آج امتِ مسلمہ فکری انتشار، نظریاتی یلغار، معاشی دباؤ اور سیاسی چیلنجوں سے دوچار ہے۔ ایسے حالات میں ایک مسلمان کا سب سے بڑا عزم یہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اقامتِ دین کی جدوجہد سے وابستہ کرے۔ یہی مقصدِ بعثتِ انبیاء ہے اور یہی امتِ مسلمہ کی اصل ذمہ داری۔

بقول علامہ اقبالؒ:

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

## اقامتِ دین کا قرآنی و نبوی تصور

اقامتِ دین سے مراد زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے احکام کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد ہے۔ یہ کوئی اختیاری دینی سرگرمی نہیں بلکہ ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (الشوریٰ:13)

یعنی دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق یہاں "دین" سے مراد محض عبادات نہیں بلکہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر مشتمل نظامِ حیات ہے۔

ایک اور مقام پر امتِ مسلمہ کی ذمہ داری یوں بیان ہوئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ... تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(آل عمران:110)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا:

"تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے، اسے اپنے ہاتھ سے بدلے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔" (صحیح مسلم)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظلم کو روکنے میں غفلت کو اجتماعی عذاب کا سبب قرار دیا۔ (سنن ابی داؤد)

## عصرِ حاضر کے فکری و سیاسی چیلنجز

آج اقامتِ دین کی راہ میں دو بڑے چیلنج نمایاں ہیں:

اوّل: فکری و نظریاتی یلغار، جس میں سیکولرازم، لبرلزم، مادہ پرستی اور قوم پرستی شامل ہیں۔

دوم: سیاسی و معاشی استعمار، جس کی نمائندگی سودی سرمایہ دارانہ نظام، عالمی مالیاتی ادارے اور بین الاقوامی طاقتیں کرتی ہیں۔

سید قطبؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "معالم فی الطریق" میں اس کیفیت کو "جدید جاہلیت" قرار دیتے ہوئے لکھا کہ انسان کو انسان کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لانا ہی اقامتِ دین کا اصل مقصد ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ نے "اشتراکیۃ الإسلام" میں واضح کیا کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں انسان کا استحصال کرتی ہیں، جبکہ اسلام ہی عدل پر مبنی متوازن معاشی نظام پیش کرتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے اسی مغلوبیت کی تصویر یوں کھینچی:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

## ہندوستانی تناظر

ہندوستان جیسے تکثیری معاشرے میں اقامتِ دین کی جدوجہد کا مطلب اقتدار کی کشمکش نہیں بلکہ دعوت، اخلاق، عدل اور اصلاحِ معاشرہ ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے "تجدید واحیائے دین" اور "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات" میں واضح کیا کہ دین کا صحیح تصور قائم کیے بغیر اقامتِ دین کی جدوجہد اپنی اصل روح سے محروم رہتی ہے۔

ترکی کے رہنما ڈاکٹر نجم الدین اربکان نے بھی "Adil Ekonomik Düzen" میں امت کی نجات کو اسلامی اصولوں کی طرف واپسی اور خود مختار اسلامی فکر سے وابستہ قرار دیا ہے۔

امیر مینائی کا شعر اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

## نئے سال کا عملی عزم

اگر ہم نئے سال کو واقعی بامقصد بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی جدوجہد کو چار بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا:

- تزکیۂ نفس اور للّٰہیت
- فکری و علمی تعمیر
- اجتماعیت اور نظمِ جماعت
- دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور خدمتِ خلق

خرم مرادؒ نے اپنی کتاب "لمحات" میں بجا طور پر لکھا ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد اسی وقت بارآور ہوتی ہے جب کارکن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط اور اس کی نیت خالص ہو۔

اسی طرح علامہ یوسف القرضاوی نے "الصحوة الإسلامية بين الاختلاف المشروع والتفرق المذموم" میں اتحادِ امت کو تحریکِ اسلامی کی کامیابی کی بنیادی شرط قرار دیا ہے۔

## اقامتِ دین اور پرامن جدوجہد

اسلامی تحریک کا مزاج ہمیشہ تعمیری، اخلاقی اور پرامن رہا ہے۔ اقامتِ دین کی جدوجہد انتشار یا تصادم

کا نام نہیں بلکہ حکمت، دعوت، کردار اور اصلاح کے ذریعے معاشرے میں خیر کے فروغ کی کوشش ہے۔

دستورِ ہند کا آرٹیکل 25 بھی ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل، اس کی تبلیغ اور اشاعت کا حق دیتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر احمد الریسونی نے "التبصر فی مقاصد الشریعۃ" میں واضح کیا ہے کہ عصر حاضر میں اسلامی تحریکوں کی اصل ترجیح مقاصدِ شریعت کے تحفظ اور انسانیت کے سامنے اسلام کے عادلانہ و رحیمانہ کردار کو پیش کرنا ہونی چاہیے۔

## حاصلِ کلام

نئے سال کا عزم محض جذباتی نعروں یا رسمی تقاریب تک محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسے علم، تزکیہ، دعوت اور مسلسل عملی جدوجہد میں ڈھلنا چاہیے۔ اقامتِ دین کا راستہ انبیائے کرامؑ اور صحابۂ کرامؓ کا راستہ ہے، جو صبر، استقامت اور قربانی سے عبارت ہے، مگر یہی انسانیت کو ظلمت سے نکال کر نورِ ہدایت تک پہنچانے کا واحد راستہ بھی ہے۔

آیئے، اس نئے سال کے آغاز پر ہم یہ عہد کریں کہ اپنی صلاحیتیں، وقت اور وسائل دینِ حق کی سربلندی اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کریں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب اہلِ ایمان اخلاص کے ساتھ اٹھتے ہیں تو باطل کے ایوان لرز اٹھتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

فضائے بدر پیدا کر، فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

☆☆☆

ضیاء الرحمٰن عابد فلاحی

# ہجرتِ مدینہ کا پیغام: تعمیرِ ملت میں نوجوانوں کا کردار

اسلامی تاریخ میں ہجرتِ مدینہ محض ایک تاریخی واقعہ یا جغرافیائی نقلِ مکانی نہیں، بلکہ ایک عظیم فکری، سماجی اور تہذیبی انقلاب کا نقطۂ آغاز ہے۔ مکہ مکرمہ میں دعوتِ اسلام نے ایمان اور عقیدے کی بنیادیں استوار کیں، جبکہ مدینہ منورہ میں اسی دعوت نے ایک منظم اسلامی معاشرے اور ریاست کی شکل اختیار کی۔ ہجرت کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ کسی بھی صالح معاشرے کی تعمیر کے لیے ایمان، قربانی، نظم اور باکردار افراد کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس عظیم جدوجہد میں نوجوان ہمیشہ صفِ اول میں رہے ہیں۔

ہجرت کا مفہوم صرف وطن چھوڑ دینا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہر اس چیز کو ترک کرنا بھی ہے جو دین کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ یہی جذبۂ ایثار اور استقامت اسلامی انقلاب کی روح ہے۔

## ہجرت کی تیاری اور نوجوانوں کی ذمہ داریاں

ہجرتِ مدینہ اچانک پیش آنے والا واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے لیے پہلے سے فکری اور دعوتی بنیادیں استوار کی گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ہجرت سے قبل مدینہ بھیجا تاکہ وہاں اسلام کی دعوت پہنچائیں، قرآن کی تعلیم دیں اور نومسلموں کی تربیت کریں۔ ان کی دعوتی جدوجہد ہی کے نتیجے میں مدینہ کا ماحول اسلام کے لیے سازگار ہوا اور ہجرت کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ اس بات کی روشن مثال ہے کہ ایک مخلص نوجوان پوری تاریخ کا رخ موڑنے میں مؤثر کردار ادا کرسکتا ہے۔

## ہجرت کا سفر اور نوجوانوں کی قربانیاں

ہجرت کے موقع پر بھی نوجوان صحابۂ کرامؓ نے بے مثال خدمات انجام دیں۔ حضرت علیؓ نے اپنی جان

کی پروا کیے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بستر پر سو کر امانت و وفاداری کی عظیم مثال قائم کی۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے نہایت حکمت اور جرأت کے ساتھ غارِ ثور تک کھانا پہنچایا، جبکہ حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ رات کے وقت قریش کی خبریں لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچاتے رہے۔ حضرت عامر بن فہیرہؓ اپنی بکریوں کے ذریعے راستوں کے نشانات مٹا دیتے تھے تاکہ دشمن تعاقب نہ کر سکے۔ حضرت زبیر بن عوامؓ بھی ابتدائی دور کے ان نوجوانوں میں شامل تھے جنہوں نے ہر مرحلے پر اسلام کی نصرت اور دفاع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہ واقعات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھنے میں نوجوانوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ محض تاریخی اتفاق نہیں بلکہ امت کے لیے ایک دائمی پیغام ہے۔

## ریاستِ مدینہ اور نئی نسل کی تعمیر

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسجدِ نبوی کی تعمیر فرمائی، مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی اور میثاقِ مدینہ کے ذریعے ایک منظم اور عادلانہ معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ان اقدامات نے صرف ایک ریاست قائم نہیں کی بلکہ ایک ایسی نسل تیار کی جو علم، کردار، خدمت اور قیادت کا نمونہ بن گئی۔

ہجرت کے بعد مدینہ میں تشکیل پانے والے علمی اور انتظامی معاشرے میں نوجوان صحابۂ کرامؓ نے اہم ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان میں حضرت زید بن ثابتؓ نمایاں ہیں، جنہوں نے کتابتِ وحی، تعلیم اور انتظامی امور میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نوجوانوں کی صلاحیتوں پر اعتماد کرتا ہے اور انہیں ملت کی تعمیر میں فعال کردار ادا کرنے کا موقع دیتا ہے۔

## آج کے نوجوانوں کے لیے ہجرت کا پیغام

آج امتِ مسلمہ کو بھی ایسے ہی باکردار، باصلاحیت اور باشعور نوجوانوں کی ضرورت ہے جو علم، اخلاق، دیانت، خدمت اور ذمہ داری کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں۔ ہجرتِ مدینہ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ قوموں کی تعمیر محض وسائل سے نہیں بلکہ صالح انسانوں سے ہوتی ہے، اور ان صالح افراد کی تیاری میں نوجوانوں کا کردار فیصلہ کن ہوتا ہے۔

اگر آج کا نوجوان حضرت مصعب بن عمیرؓ کے جذبۂ دعوت، حضرت علیؓ کی وفاداری، حضرت اسماءؓ کی ہمت، حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کی ذمہ داری اور حضرت زید بن ثابتؓ کی علمی لگن کو

اپنی زندگی کا حصہ بنالےتو وہ اپنی ملت اور معاشرے میں مثبت تبدیلی کا مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

ہجرتِ مدینہ میں ہمارے لیے یہ اہم پیغام ہے کہ ہر بڑی تبدیلی کے پیچھے ایمان، قربانی اور باکردار افراد کی جدوجہد ہوتی ہے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ نوجوان صحابۂ کرامؓ نے ہجرت کی تیاری، اس کے مراحل اور اس کے بعد اسلامی معاشرے کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آج بھی ملت کا روشن مستقبل ایسے ہی نوجوانوں سے وابستہ ہے جو علم و عمل، کردار و تقویٰ اور خدمتِ دین کے جذبے سے سرشار ہوں۔ یہی ہجرتِ مدینہ کا زندہ پیغام ہے اور یہی تعمیرِ ملت کی حقیقی بنیاد بھی۔

☆☆☆

اسامہ احسن صدیقی

# خواتینِ اسلام اور سفرِ ہجرت

## عزیمت، صبر اور فکری شعور کی داستان

اسلامی تاریخ میں ہجرت ایک عظیم سنگِ میل ہے جس نے دعوتِ اسلام کو نئی سمت عطا کی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں اہلِ ایمان کی قربانی، استقامت اور اللہ پر کامل بھروسا پوری طرح نمایاں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ حق کے علمبردار آزمائشوں سے گزارے جاتے ہیں، کبھی دنیا کی کشش سے اور کبھی ظلم و جبر سے، تاکہ ایمان کی حقیقت ظاہر ہو جائے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں توحید کی دعوت پیش کی تو اہلِ ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ایسے حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی۔ صحابۂ کرامؓ نے وطن، خاندان، مال و جائیداد اور آسائشیں چھوڑ دیں، مگر ایمان پر کوئی سمجھوتہ گوارا نہ کیا۔ اس سفر میں جہاں مردوں نے عظیم قربانیاں دیں، وہیں خواتینِ اسلام نے بھی صبر، عزیمت اور استقامت کی ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک اہلِ ایمان کے لیے مشعلِ راہ رہیں گی۔

### حضرت لیلیٰ بنت حثمہؓ: پہلی ہجرتوں کی ایک روشن مثال

حضرت ام عبداللہ لیلیٰ بنت حثمہؓ ان اولین خواتین میں شامل تھیں جنھوں نے اپنے شوہر حضرت عامر بن ربیعہؓ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ روانگی کے وقت حضرت عمرؓ، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہاں آئے اور سفر کا سبب پوچھا۔

حضرت لیلیٰؓ نے فرمایا کہ مکہ والوں کے ظلم نے ہمیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے، اب ہم اللہ کی زمین میں ایسی جگہ جائیں گے جہاں اپنے دین پر آزادی سے عمل کر سکیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ متاثر ہوئے اور بے اختیار فرمایا: ''صَحِبَكُمُ اللّٰهُ''، یعنی اللہ تمہارا ساتھی ہو۔

یہ واقعہ اہلِ ایمان کی استقامت اور خواتین کے غیر معمولی حوصلے کی واضح دلیل ہے۔

## حضرت رقیہؓ اور حضرت زینبؓ: قربانی اور صبر کی داستان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی زندگی ہجرت اور قربانی کی روشن مثال ہے۔ ابتدا میں ان کا نکاح عتبہ بن ابی لہب سے ہوا، لیکن اسلام دشمنی کے باعث ابولہب کے دباؤ پر انہیں طلاق دے دی گئی۔ بعد ازاں حضرت عثمان بن عفانؓ سے ان کا نکاح ہوا۔

جب مکہ میں مسلمانوں پر ظلم بڑھا تو حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ابراہیم اور لوط علیہما السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔'' یہ ہجرت اس بات کی علامت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے کی خواتین بھی دین کی خاطر قربانی اور آزمائش کے راستے پر گامزن تھیں۔ بعد میں حضرت رقیہؓ مدینہ منورہ میں بیمار ہوئیں اور غزوۂ بدر کے موقع پر وفات پا گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی وفات پر غمگین ہوئے اور ان کی قبر پر تشریف لے گئے۔

اسی طرح حضرت زینبؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑی صاحبزادی بھی صبر و وفاداری کا پیکر تھیں۔ ان کے شوہر ابوالعاصؓ ابتدا میں مسلمان نہ ہوئے۔ غزوۂ بدر کے بعد جب وہ قیدی بن کر مدینہ آئے تو حضرت زینبؓ نے فدیے کے لیے اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کا دیا ہوا ہار بھیجا۔ یہ ہار دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار واپس کر دو، یہ زینب کی ماں کی یادگار ہے۔

ابوالعاصؓ کو اس شرط پر آزاد کیا گیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں گے۔ راستے میں کفار نے انہیں تکلیف پہنچائی، جس کے اثرات ان کی صحت پر پڑے۔ سن 8 ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی وفات پر بہت غمگین ہوئے اور فرمایا کہ زینب میری سب سے اچھی بیٹی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی۔

## حضرت ام سلمہؓ اور حضرت اسماءؓ: توکل، ہمت اور وفاداری

حضرت ام سلمہؓ کی ہجرت صبر و استقامت کی عظیم مثال ہے۔ وہ اپنے شوہر حضرت ابوسلمہؓ اور بچے کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں، مگر راستے میں خاندان والوں نے انہیں روک لیا اور شوہر سے جدا کر دیا، جبکہ دوسرے خاندان نے بچے کو بھی اپنے پاس رکھ لیا۔

کئی دن تک شدید غم برداشت کرنے کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے بچے کو لیا اور تنہا مدینہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ راستے میں حضرت عثمان بن طلحہؓ نے انہیں تنہا دیکھا تو ان کے ساتھ مدینہ تک گئے۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایسا شریف اور باوقار ساتھی کبھی نہیں دیکھا۔

بعد میں حضرت ابو سلمہؓ غزوۂ احد کے زخموں کی وجہ سے وفات پا گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کو صبر کی تلقین فرمائی اور بہتر بدلے کی دعا سکھائی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں امہات المؤمنین میں شامل ہونے کا شرف عطا فرمایا۔

ہجرت کے موقع پر حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے بھی عظیم کردار ادا کیا۔ وہ غارِ ثور میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے لیے کھانا پہنچاتیں۔ ایک موقع پر کھانے کی پوٹلی باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو انہوں نے اپنے نطاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا، جس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں ذات النطاقین کا لقب عطا فرمایا۔

## ہجرت کا پیغام: آج کے لیے سبق

یہ واقعات محض تاریخ کے صفحات نہیں بلکہ ایمان، قربانی، عزیمت اور اللہ پر اعتماد کی روشن مثالیں ہیں۔ حضرت لیلیٰ بنت حثمہؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت اسماءؓ نے ثابت کیا کہ دین کی سربلندی کے لیے قربانی کا جذبہ صرف مردوں تک محدود نہیں، بلکہ خواتینِ اسلام نے بھی تاریخ کے عظیم ترین کارنامے انجام دیے۔

انہوں نے وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، عزیزوں سے جدائی برداشت کی، مگر ایمان کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔ آج بھی امت کو انہی صفات کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنا وقت، صلاحیت اور وسائل پیش کریں اور دنیاوی مفادات پر دین کے تقاضوں کو ترجیح دیں۔

ہجرت کے یہ روشن ابواب گواہی دیتے ہیں کہ ایمان کی حفاظت اور حق کی سربلندی کا راستہ ہمیشہ قربانی، صبر اور استقامت سے ہو کر گزرتا ہے۔

اف یہ جادہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

اللہ تعالیٰ ہمیں صحابیاتِ رسول ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے، ایمان و عمل میں مضبوطی اختیار کرنے اور دین کی خدمت کے لیے اخلاص عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر اسماء فیروز

# سوشل میڈیا، لبرل ازم اور مسلم ذہن پر نئی تہذیبی یلغار

اکیسویں صدی میں تہذیبی کشمکش نے اپنی ہیئت بدل لی ہے۔ ماضی میں اقوام کی شکست و فتح کا فیصلہ عسکری طاقت، سیاسی غلبے اور معاشی استحصال کے ذریعے کیا جاتا تھا، لیکن موجودہ دور میں ذہن، فکر اور شعور کو فتح کرنا اصل ہدف بن چکا ہے۔ ڈیجیٹل میڈیا، بالخصوص سوشل میڈیا، نے دنیا کو ایک گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے جہاں معلومات، نظریات، اقدار اور طرزِ زندگی لمحوں میں سرحدیں عبور کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تہذیبی یلغار کی سب سے مؤثر صورت فکری اور ثقافتی یلغار ہے۔

انسانی تاریخ محض جنگوں، سلطنتوں اور سیاسی انقلابات کی تاریخ نہیں بلکہ افکار، اقدار اور تہذیبوں کے تصادم کی بھی تاریخ ہے۔ جب بھی کوئی تہذیب اپنے فکری نظام، اخلاقی تصورات اور سماجی اقدار کے ذریعے دوسری تہذیب پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہے تو اس عمل کو تہذیبی یلغار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس یلغار کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ کبھی تلواریں، توپیں اور فوجیں اس کا ذریعہ بنتی تھیں، کبھی نوآبادیاتی اقتدار، تعلیمی ادارے اور معاشی نظام اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاتے تھے، لیکن عصرِ حاضر میں یہ عمل ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جہاں ذہنوں کی تشکیل اسکرینوں کے ذریعے کی جا رہی ہے۔

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے ابلاغ کی دنیا میں ایسی غیر معمولی تبدیلی پیدا کی ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آج ایک فرد اپنی جیب میں موجود موبائل فون کے ذریعے دنیا بھر کے افکار، ثقافتوں، نظریات اور طرزِ زندگی سے مسلسل رابطے میں رہتا ہے۔ اس مسلسل رابطے نے جہاں علم کے نئے امکانات پیدا کیے ہیں، وہیں ذہنی انتشار، تہذیبی اختلاط اور فکری دباؤ کی نئی صورتیں بھی جنم دی ہیں۔

سوشل میڈیا، فیس بک، انسٹاگرام، یوٹیوب، ٹک ٹاک اور دیگر پلیٹ فارم صرف معلومات کی ترسیل کے ذرائع نہیں رہے بلکہ وہ انسانی ترجیحات، سماجی رویوں، سیاسی رجحانات اور اخلاقی

تصورات کی تشکیل میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان پلیٹ فارمز کے الگورتھمز صارف کی دلچسپی، کمزوری، نفسیاتی رجحان اور طرزِ عمل کو مسلسل جانچتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق ایسا مواد پیش کرتے ہیں جو اس کے ذہنی سانچے کو مزید مستحکم یا تبدیل کر سکے۔ اس طرح بظاہر آزاد انتخاب کے پس منظر میں ایک خاموش فکری رہنمائی (Silent Guidance) جاری رہتی ہے۔

مسلم معاشروں کے لیے یہ صورتِ حال اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اسلام محض چند مذہبی رسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل تصورِ حیات پیش کرتا ہے۔ جب کوئی ایسا فکری نظام، جو زندگی، آزادی، اخلاق، خاندان، مذہب اور انسان کے بارے میں مختلف تصورات رکھتا ہو، مسلسل میڈیا کے ذریعے عام کیا جائے تو لازماً اس کے اثرات مسلم ذہن پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ خصوصاً نوجوان نسل، جو اپنی شخصیت، شناخت اور مستقبل کی تشکیل کے مرحلے میں ہوتی ہے، اس اثر پذیری کا سب سے بڑا ہدف بنتی ہے۔

اس مضمون میں سوشل میڈیا کو جدید تہذیبی طاقت کے طور پر زیرِ بحث لاتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح لبرل ازم کے بعض تصورات، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے الگورتھمز، انفلوئنسر کلچر اور بصری میڈیا کے ذریعے مسلم نوجوانوں کے ذہن پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ مزید برآں اسلامی تصورِ حیات اور لبرل فکر کے مابین بنیادی امتیازات، اس تہذیبی چیلنج کے نتائج اور اسلام کی روشنی میں اس کے ممکنہ حل پر بھی گفتگو کی جائے گی۔

## تہذیبی یلغار: مفہوم و تصور

اصطلاحی اعتبار سے تہذیب اس جامع نظامِ حیات کا نام ہے جس کے تحت کسی قوم کے عقائد، اخلاق، قوانین، سماجی ادارے، معاشی اصول، سیاسی تصورات، علمی روایات اور جمالیاتی ذوق تشکیل پاتے ہیں۔ گویا تہذیب کسی قوم کی اجتماعی شخصیت کا مکمل اظہار ہوتی ہے۔ مشہور مسلم مؤرخ ابن خلدون کے نزدیک تہذیب صرف مادی ترقی کا نام نہیں بلکہ انسانی اجتماع کی وہ منظم صورت ہے جس میں علم، سیاست، معیشت، اخلاق اور مذہب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو کر ایک مکمل معاشرتی نظام تشکیل دیتے ہیں۔

مغربی مفکرین بھی تہذیب کو محض سائنسی ترقی تک محدود نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک بھی تہذیب ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جو انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تاہم مغربی فکر

میں اکثر تہذیب کی بنیاد انسانی عقل، تجربے اور تاریخی ارتقا کو قرار دیا جاتا ہے، جبکہ اسلامی تصور میں تہذیب کی بنیاد وحیِ الٰہی، اخلاقِ نبوی اور انسانی فطرت کے باہمی امتزاج پر قائم ہے۔

تہذیبی یلغار سے مراد وہ منظم یا غیر منظم عمل ہے جس کے ذریعے ایک تہذیب دوسری تہذیب کے عقائد، اقدار، اخلاق، طرزِ زندگی اور فکری بنیادوں کو متاثر کرنے یا تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔ عصرِ حاضر میں تہذیبی یلغار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لوگوں کے افکار و عقائد اور خیالات کو تفریح، تعلیم، میڈیا، اشتہارات، فلموں، فیشن، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور سوشل میڈیا کے ذریعے اس انداز سے متاثر کیا جاتا ہے کہ لوگ خود ہی غالب تہذیب کے طرزِ زندگی کو ترقی، آزادی اور کامیابی کی علامت سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں بظاہر ذہنی آزادی تو برقرار رہتی ہے مگر فکری استعمار لگاتار اس کی جڑوں کو کمزور کرتا چلا جاتا ہے۔

مسلمانوں کو تقریباً ہر دور میں فکری اور تہذیبی چیلنجز کا مسلسل سامنا رہا ہے۔ عباسی دور میں یونانی فلسفے کے تراجم نے ایک نئی علمی فضا پیدا کی۔ مسلمان علماء نے اس چیلنج سے فرار اختیار کرنے کے بجائے تنقیدی مطالعہ کیا، مفید علوم سے استفادہ کیا اور غیر اسلامی نظریات کا علمی جواب بھی دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اسلامی تہذیب نے اپنی شناخت برقرار رکھتے ہوئے علمی ترقی کی نئی مثالیں قائم کیں۔ بعد ازاں صلیبی جنگوں اور تاتاری حملوں نے مسلم دنیا کو متاثر کیا، لیکن ان سے زیادہ دیرپا اثرات نوآبادیاتی دور نے مرتب کیے۔ یورپی طاقتوں نے صرف مسلم ممالک پر سیاسی قبضہ نہیں کیا بلکہ ان کے تعلیمی نظام، قانونی ڈھانچے، زبان، نصاب، معاشرت اور فکری ترجیحات کو بھی تبدیل کرنے کی منظم کوشش کی۔ اسی لیے متعدد مسلم مفکرین نے نوآبادیات کو صرف سیاسی نہیں بلکہ تہذیبی استعمار بھی قرار دیا ہے۔ الجزائری مفکر مالک بن نبی نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ کسی قوم کو غلام بنانے سے پہلے اس کے ذہن کو غلام بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی معاشرہ اپنی تہذیبی خود اعتمادی کھو دیتا ہے تو دیگر تہذیبی افکار اس کی شناخت پر بآسانی غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

## لبرل ازم: تصور، پس منظر اور بنیادی اصول

معاصر دنیا میں جن فکری نظریات نے سیاست، قانون، معیشت، تعلیم، انسانی حقوق اور سماجی اقدار کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، ان میں لبرل ازم (Liberalism) کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ جدید مغربی ریاست، جمہوری اداروں، انسانی حقوق کے بیشتر بین الاقوامی منشورات پر کسی نہ کسی درجے

میں لبرل فکر کے اثرات نمایاں ہیں۔ لہذا لبرل ازم محض ایک سیاسی نظریہ نہیں رہا بلکہ ایک تہذیبی اور فکری رجحان کی صورت اختیار کر چکا ہے، جو دنیا کے مختلف معاشروں، بالخصوص نوجوان نسل کے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔

اصطلاحی اعتبار سے لبرل ازم ایک ایسا فلسفۂ سیاست و معاشرت ہے جس کے مطابق انسان بنیادی طور پر آزاد پیدا ہوتا ہے، اس لیے اس کی آزادی پر پابندی صرف اسی حد تک جائز ہے جہاں وہ دوسروں کی آزادی کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس تصور میں فرد کو معاشرے اور ریاست پر بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جبکہ ریاست کا بنیادی فریضہ فرد کے حقوق کا تحفظ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ لبرل ازم کوئی جامد نظریہ نہیں بلکہ ایک ارتقائی فکری روایت ہے۔ اٹھارہویں صدی کا لبرل ازم، انیسویں صدی کے لبرل ازم سے مختلف ہے، اور اکیسویں صدی میں اس کے اندر بھی متعدد فکری رجحانات پیدا ہو چکے ہیں، مثلاً کلاسیکی لبرل ازم، سماجی لبرل ازم، معاشی لبرل ازم اور جدید ثقافتی لبرل ازم۔

کسی بھی نظریے کی پیدائش اچانک نہیں ہوتی بلکہ وہ مخصوص تاریخی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں مذہبی اداروں اور بادشاہت کے درمیان ایک مضبوط اتحاد قائم تھا۔ کلیسا صرف مذہبی معاملات ہی نہیں بلکہ سیاست، تعلیم، قانون اور علمی تحقیق پر بھی گہرا اثر رکھتا تھا۔ بعض اوقات مذہبی اختیارات کے غلط استعمال، سائنسی تحقیقات کی مخالفت اور سیاسی استبداد نے عوام میں بے چینی پیدا کی۔ یہی حالات بعد میں اصلاحِ مذہب (Reformation) اور تحریکِ تنویر (Enlightenment) کی راہ ہموار کرنے کا باعث بنے۔

سولہویں صدی میں یورپ کے اندر اصلاحِ مذہب کی تحریک اٹھی، جس نے کلیسا کی مطلق مذہبی اور سیاسی بالادستی کو چیلنج کیا۔ اس تحریک کا بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ مذہبی ادارے احتساب سے بالاتر نہیں ہونے چاہییں اور افراد کو مذہبی معاملات میں بھی غور و فکر اور انتخاب کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس تحریک کے نتیجے میں یورپ کے مذہبی اور سیاسی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ مختلف ریاستوں نے کلیسا کے اثر سے خود کو آزاد کرنا شروع کیا، اور آہستہ آہستہ مذہب اور ریاست کے تعلق پر نئے مباحث جنم لینے لگے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں سے بعد میں سیکولر ریاست اور لبرل سیاست کے ابتدائی تصورات نے جنم لیا۔

سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی تحریکِ تنویر نے لبرل ازم کی فکری بنیادوں کو مزید مضبوط کیا۔ اس تحریک کے مفکرین نے انسانی عقل، تجربے، سائنسی تحقیق اور تنقیدی سوچ کو غیر معمولی اہمیت دی۔ ان کے نزدیک انسان کو اپنے فیصلے خود کرنے چاہییں اور سیاسی نظام عوام کی رضامندی پر قائم ہونا چاہیے، نہ کہ موروثی بادشاہت یا غیر محدود مذہبی اقتدار پر۔ یہ تحریک جدید مغربی سیاسی فکر کی تشکیل میں سنگِ میل ثابت ہوئی۔ اسی دور میں قانون کی حکمرانی، شہری آزادیوں، آئینی حکومت اور بنیادی انسانی حقوق جیسے تصورات مضبوط ہوئے، جنہوں نے بعد میں جدید جمہوری ریاستوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

چودھویں سے سولہویں صدی کے درمیان یورپ میں ایک عظیم علمی و ثقافتی تحریک برپا ہوئی جسے نشاۃِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس تحریک نے یونانی و رومی علوم کے احیاء، فنونِ لطیفہ، سائنسی تحقیق اور انسانی عقل کی اہمیت کو فروغ دیا۔ نشاۃِ ثانیہ کا سب سے اہم اثر یہ تھا کہ انسان کو کائنات کے فعال اور بااختیار فرد کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں فرد کی صلاحیتوں، آزادی اور شخصی تشخص پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اگرچہ اس تحریک کے بہت سے مثبت نتائج سامنے آئے، جیسے سائنسی ترقی، علمی تحقیق اور فنون کا فروغ، لیکن اسی ماحول نے بعد میں مذہب کو ایک اختیاری امر کے طور پر متعارف کرایا۔

لبرل فکر کی تشکیل میں متعدد مفکرین نے کردار ادا کیا، تاہم چند شخصیات کا اثر غیر معمولی رہا۔ جان لاک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان فطری طور پر زندگی، آزادی اور ملکیت کے حقوق رکھتا ہے، اور حکومت کا اصل مقصد انہی حقوق کا تحفظ ہے۔ اگر حکومت ان حقوق کی حفاظت میں ناکام ہو جائے تو عوام کو اسے تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ مونٹیسکیو نے اختیارات کی تقسیم (Separation of Powers) کا نظریہ پیش کیا، جس کا مقصد اقتدار کے ارتکاز کو روکنا تھا۔ جان اسٹورٹ مل نے آزادیِ اظہار، فکری آزادی اور انفرادی خودمختاری کی مضبوط وکالت کی۔ ان کے نزدیک معاشرے کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب افراد کو سوچنے، اختلاف کرنے اور اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہو۔ ان مفکرین کے نظریات نے جدید مغربی سیاسی فلسفے، جمہوری اداروں اور انسانی حقوق کے مباحث پر گہرے اثرات مرتب کیے، اور بعد کی صدیوں میں لبرل ازم ایک منظم فکری روایت کی صورت اختیار کرتا گیا۔

جدید لبرل ازم کے اہم اجزاء میں سیکولرزم بھی شامل ہے، اگرچہ ہر لبرل مفکر اس کی یکساں

تعبیر نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر سیکولر فکر مذہب اور ریاست کے تعلق کو محدود کرنے کی کوشش کرتی ہے، تاکہ سیاسی فیصلے مذہبی اداروں کے بجائے عوامی نمائندوں اور آئینی اصولوں کی بنیاد پر کیے جائیں۔

لیکن اسلامی تہذیب کی تاریخ اس سے مختلف رہی ہے۔ اسلام میں مذہب محض عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ اخلاق، قانون، معیشت، معاشرت اور اجتماعی عدل کے لیے بھی اصول فراہم کرتا ہے۔ اسلام آزادی کا مخالف نہیں بلکہ اس کا ایک مختلف تصور پیش کرتا ہے۔ اسلام انسان کو غلامی سے نجات، ظلم کے خاتمے، عزتِ نفس، عدل، مساوات اور انسانی کرامت کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس آزادی کو اخلاقی جواب دہی اور بندگیِ الٰہی سے الگ نہیں کرتا۔ اسلام فرد اور معاشرے کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ وہ نہ فرد کو اجتماعی نظام میں گم کر دیتا ہے اور نہ معاشرے کو انفرادی خواہشات کے تابع بنا دیتا ہے۔ یہی توازن اسلامی تہذیب کی نمایاں خصوصیت ہے۔

## سوشل میڈیا: ایک طاقتور فکری ہتھیار

موجودہ صدی کو بجا طور پر "ڈیجیٹل عہد" کہا جاتا ہے۔ اگر بیسویں صدی میں پرنٹ میڈیا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن رائے عامہ کی تشکیل کے اہم ذرائع تھے تو اکیسویں صدی میں یہ مقام سوشل میڈیا نے حاصل کر لیا ہے۔ سوشل میڈیا اب محض باہمی رابطے کا وسیلہ نہیں رہا بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر ابلاغی نظام بن چکا ہے جو انسان کی معلومات، جذبات، ترجیحات، سماجی رویوں، سیاسی رجحانات اور حتیٰ کہ اس کی تہذیبی شناخت کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے انسانی زندگی میں بے شمار آسانیاں پیدا کی ہیں۔ علم تک رسائی، عالمی روابط، دعوت و تبلیغ، تعلیمی سرگرمیاں، سماجی خدمات اور اظہارِ رائے کے نئے امکانات اسی کے ذریعے وجود میں آئے ہیں۔ لیکن ہر طاقتور ذریعہ اپنے ساتھ بعض خدشات بھی لاتا ہے۔ جب یہی پلیٹ فارم مخصوص فکری بیانیوں، تہذیبی رجحانات اور نظریاتی تصورات کی مسلسل اشاعت کا ذریعہ بن جائیں تو ان کا کردار محض ابلاغی نہیں رہتا بلکہ وہ ذہن سازی (Mind Formation) اور تہذیبی تشکیل (Cultural Formation) کے مؤثر آلات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ڈیجیٹل انقلاب نے معلومات تک رسائی کو غیر معمولی حد تک آسان بنا دیا ہے۔ ایک عام فرد چند لمحوں میں دنیا کی بڑی لائبریریوں، جامعات، اخبارات، جرائد اور علمی ذخائر تک رسائی حاصل

کر سکتا ہے۔ بظاہر یہ صورتِ حال علم کے فروغ کے لیے نہایت مثبت معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ مسئلہ معلومات کی کمی نہیں بلکہ معلومات کی کثرت (Information Overload) ہے۔ جب صحیح، غلط، مستند، غیر مستند، علمی، جذباتی، تبلیغی، تجارتی اور سیاسی مواد ایک ہی رفتار سے انسان کے سامنے آنے لگے تو عام قاری کے لیے حقیقت اور تاثر (Reality and Perception) کے درمیان فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ فکری انتشار کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ سوشل میڈیا پر ہر شخص بیک وقت مقرر، مبصر، ناقد، مفتی اور تجزیہ نگار بن سکتا ہے۔ رائے دینے کے لیے نہ کسی علمی اہلیت کی شرط ہے اور نہ ہی کسی ادارہ جاتی ذمہ داری کی پابندی۔ نتیجتاً علمی مسائل بھی جذباتی نعروں اور مختصر ویڈیوز میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور پیچیدہ فکری مباحث چند سیکنڈ کے کلپس میں سمیٹ دیے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال مسلم نوجوانوں کے لیے مزید حساس ہے، کیونکہ دینی علوم اپنی فطرت میں گہرائی، تدریج، استناد اور علمی روایت کے متقاضی ہیں، جبکہ سوشل میڈیا فوری تاثر، جذباتی اپیل اور مختصر اظہار کو ترجیح دیتا ہے۔ اس تضاد کے نتیجے میں بہت سے نوجوان مطالعہ، تحقیق اور اہلِ علم سے استفادے کے بجائے وائرل مواد کو علم کا متبادل سمجھنے لگتے ہیں۔

سوشل میڈیا کی سب سے غیر معمولی خصوصیت اس کے الگورتھمز ہیں۔ الگورتھم دراصل ایسے ریاضیاتی اور کمپیوٹرائزڈ نظام ہیں جو صارف کے ہر عمل کا تجزیہ کرتے ہیں؛ وہ کن ویڈیوز پر زیادہ دیر رکتا ہے، کن موضوعات کو پسند کرتا ہے، کس قسم کے صفحات دیکھتا ہے، کن لوگوں سے رابطہ رکھتا ہے اور کن خیالات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہ معلومات محض تکنیکی مقاصد کے لیے استعمال نہیں ہوتیں بلکہ انہی کی بنیاد پر ہر صارف کے لیے ایک الگ ڈیجیٹل دنیا تشکیل دی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ انسان کو وہی مواد زیادہ دکھایا جاتا ہے جس سے اس کی دلچسپی برقرار رہے۔ بظاہر یہ سہولت محسوس ہوتی ہے، لیکن اس کے نتیجے میں انسان ایک محدود فکری دائرے (Echo Chamber) میں محصور ہو جاتا ہے جہاں مخالف آراء، متوازن تجزیے اور علمی اختلافات اس کی نظروں سے اوجھل رہنے لگتے ہیں۔ اسی عمل کو جدید ابلاغی مطالعات میں "Mind Shaping" یا "Behavioural Influence" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی شخص کو براہِ راست کوئی نظریہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے سامنے ایسے حالات پیدا کیے جاتے ہیں کہ وہ خود اسی نتیجے تک پہنچے جس کی سمت الگورتھم اسے لے جا رہا ہوتا ہے۔

سوشل میڈیا نے ایک نئی سماجی قوت کو جنم دیا ہے جسے" انفلوئنسر کلچر" کہا جاتا ہے۔ ماضی میں رائے عامہ کی تشکیل میں علماء، اساتذہ، دانشور، ادیب اور صحافی نمایاں کردار ادا کرتے تھے،لیکن آج لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد کی فکری ترجیحات ایسے افراد سے متاثر ہوتی ہیں جن کی اصل شہرت ان کی علمی قابلیت نہیں بلکہ ان کی مقبولیت، طرزِ گفتگو یا تفریحی انداز ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی صرف سماجی نہیں بلکہ تہذیبی بھی ہے۔نوجوان نسل شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی شخصیات کو اپنا آئیڈیل بناتی ہے جنہیں سوشل میڈیا مسلسل نمایاں کرتا ہے۔ ان کے لباس، زبان، طرزِ زندگی، تعلقات، ترجیحات اور اقدار بھی رفتہ رفتہ قابلِ تقلید محسوس ہونے لگتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ہر انفلوئنسر منفی کردار ادا کرتا ہے۔ بہت سے دینی، تعلیمی اور سماجی شخصیات بھی انہی پلیٹ فارمز کے ذریعے مثبت خدمات انجام دے رہی ہیں۔ مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مقبولیت (Popularity) کو حقانیت (Truth) کا معیار سمجھ لیا جائے، اور" فالوورز" کی تعداد علمی وزن کا متبادل بن جائے۔

ٹک ٹاک، انسٹا گرام ریلز، یوٹیوب شارٹس اور دیگر شارٹ ویڈیو پلیٹ فارمز نے ابلاغ کے انداز کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ اب چند سیکنڈ کی ویڈیو لاکھوں افراد تک پہنچ سکتی ہے۔شارٹ ویڈیوز کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل سے زیادہ جذبات کو مخاطب کرتی ہیں۔موسیقی، بصری اثرات، ڈرامائی انداز، تیز رفتار منظر کشی اور مؤثر جملے مل کر ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں جو طویل علمی گفتگو سے کہیں زیادہ دیر تک ذہن میں رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظریات بھی اب کتابوں سے زیادہ بصری علامتوں، جذباتی کہانیوں اور وائرل کلپس کے ذریعے منتقل کیے جا رہے ہیں۔ جب کسی تصور کو بار بار دلکش انداز میں پیش کیا جائے تو وہ آہستہ آہستہ عام شعور کا حصہ بن جاتا ہے،خواہ اس کے حق میں مضبوط علمی دلائل موجود نہ ہوں۔

## سوشل میڈیا اور لبرل بیانیئے کی ترویج

اکیسویں صدی میں سوشل میڈیا محض رابطے اور تفریح کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ یہ افکار، اقدار اور طرزِ زندگی کی تشکیل کا ایک طاقتور وسیلہ بن چکا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف معلومات منتقل نہیں کرتے بلکہ مخصوص زاویہ نظر، ترجیحات اور سماجی رویوں کو بھی فروغ دیتے ہیں۔ اسی لیے معاصر ابلاغی علوم میں میڈیا کو" بیانیہ سازی" (Narrative Building) کا سب سے مؤثر آلہ قرار دیا جاتا ہے۔ بیانیہ (Narrative) سے مراد واقعات اور نظریات کی ایسی تعبیر ہے جو کسی مخصوص فکر یا

طرزِ زندگی کو فطری، معقول اور قابلِ قبول بنا کر پیش کرے۔ جب یہی عمل مسلسل فلموں، ڈراموں، اشتہارات، مختصر ویڈیوز اور سوشل میڈیا پوسٹس کے ذریعے انجام پائے تو وہ آہستہ آہستہ اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ لبرل بیانیہ کی ترویج میں بھی اس نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔

مسلم ذہن پر لبرل فکر کے اثرات یکساں اور مطلق نہیں، بلکہ ان کی نوعیت مختلف معاشروں، تعلیمی پس منظر اور فکری تربیت کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جب سوشل میڈیا، تفریحی صنعت اور عالمی ابلاغی نظام مخصوص فکری تعبیرات کو مسلسل فروغ دیتے ہیں تو مذہبی یقین، تہذیبی خوداعتمادی اور اسلامی شناخت پر ان کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں عام مسلم سماج شناختی بحران، خاندانی نظام کی کمزوری، اخلاقی اقدار میں تبدیلی، دین و دنیا کی تقسیم کا تصور، امت کے فکری اتحاد پر منفی اثرات، تہذیبی خوداعتمادی میں کمی، فکری انحصار اور تخلیقی صلاحیتوں کا زوال جیسے چیلنجز کا سامنا کر رہا ہے۔

ہر تبدیلی میں نوجوان طبقہ سب سے زیادہ اثر قبول کرتا ہے، کیونکہ یہی عمر شخصیت سازی، فکری تشکیل اور اقدار کے تعین کا مرحلہ ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں بھی مسلم نوجوان عالمی ڈیجیٹل ماحول، تیز رفتار ابلاغ اور متنوع فکری بیانیوں سے براہِ راست متاثر ہو رہے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ نوجوان کیوں متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ اثر پذیر کیوں ہیں؟ اس کی وجوہات صرف سوشل میڈیا تک محدود نہیں بلکہ تعلیمی، فکری، خاندانی اور سماجی عوامل بھی اس میں شریک ہیں۔ جیسے دینی بصیرت کی کمی، تنقیدی فکر کا بحران، سوشل میڈیا پر ضرورت سے زیادہ وقت گزارنا، سلیبریٹی کلچر، اوپن ڈسکشن کی کمی، شناخت کی کھوج اور دیگر نفسیاتی و سماجی عوامل وغیرہ۔ ان چیلنجز کا جواب، نہ دنیا سے کنارہ کشی ہے اور نہ جدید علوم و ٹکنالوجی سے بے اعتنائی، بلکہ مضبوط دینی بصیرت، تنقیدی شعور، علمی اعتماد اور متوازن مکالمہ ہے۔ ایک ایسا مسلم ذہن جو اپنی روایت سے بھی واقف ہو اور عصرِ حاضر کے فکری مباحث کو بھی سمجھتا ہو، وہی اس تہذیبی کشمکش میں مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔

کسی بھی فکری یا تہذیبی چیلنج کا مؤثر جواب محض ردِعمل یا جذباتی نعروں سے نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے ایک جامع علمی، تربیتی اور عملی حکمتِ عملی درکار ہوتی ہے۔ سوشل میڈیا، لبرل افکار اور عالمی ثقافتی اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی جدید ذرائع ابلاغ سے کنارہ کشی یا دنیا سے انقطاع میں نہیں، بلکہ ایسے متوازن طرزِ عمل میں ہے جو ایک طرف اسلامی اصولوں سے مضبوط وابستگی

پیدا کرے اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی عطا کرے۔ اسلام نے ہر دور میں علم، حکمت، اعتدال اور بصیرت کو دعوت و اصلاح کا بنیادی ذریعہ قرار دیا ہے، اسی لیے موجودہ تہذیبی چیلنج کا جواب بھی انہی اصولوں کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔

اکیسویں صدی کا انسان معلومات کے بے مثال سیلاب میں زندگی گزار رہا ہے۔ سوشل میڈیا نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں افکار، تہذیبیں اور نظریات ہر لمحہ ایک دوسرے سے برسرِ تعامل ہیں۔ اس ماحول میں مسلم معاشروں کے سامنے سب سے بڑا چیلنج ٹیکنالوجی کا وجود نہیں بلکہ اس کے ذریعے منتقل ہونے والے فکری اور تہذیبی اثرات ہیں۔ اسلام علم، تحقیق، مکالمہ اور حکمت کا دین ہے۔ اس نے کبھی علم سے فرار یا زمانے سے لاتعلقی کی تعلیم نہیں دی، بلکہ ہر دور کے چیلنجز کا مقابلہ علم، اخلاق اور بصیرت سے کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس لیے سوشل میڈیا یا جدید تہذیب کو مطلق خیر یا مطلق شر قرار دینا ایک غیر متوازن رویہ ہوگا۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان جدید ذرائع ابلاغ سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنی فکری خودمختاری، دینی شناخت اور اخلاقی اقدار کو محفوظ رکھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فکری خوداعتمادی صرف ماضی کے کارناموں پر فخر سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ علم، تحقیق، کردار اور تخلیقی صلاحیت سے وجود میں آتی ہے۔ اگر مسلم نوجوان قرآن و سنت کی رہنمائی، تنقیدی فکر، عصری علوم اور جدید ذرائع ابلاغ کے مثبت استعمال کو یکجا کر لیں تو وہ نہ صرف تہذیبی یلغار کا مؤثر مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر ایک متوازن، عادلانہ اور انسان دوست تہذیبی بیانیہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

ابوخزیمہ فلاحی

# جب طاقت سوال کے کٹھرے میں کھڑی ہو جائے

## ایران سے عراق تک طاقت، مفاد اور ضمیر کی کشمکش

جنگیں صرف میدانِ جنگ میں نہیں لڑی جاتیں، ان سے پہلے الفاظ کی ایک جنگ بھی لڑی جاتی ہے۔ توپوں کی گھن گرج سنائی دینے سے پہلے دلیلوں، دعوؤں، خوف، خدشات اور قومی سلامتی کے نام پر ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے جو جنگ کو ناگزیر ثابت کرے۔ عوام کو بتایا جاتا ہے کہ دشمن دروازے پر کھڑا ہے، خطرہ قریب ہے، کارروائی ناگزیر ہے، اور طاقت کا استعمال امن کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

لیکن تاریخ کا ایک عجیب مزاج ہے۔ وہ جنگ کے دوران نہیں بولتی، بلکہ اس وقت بولتی ہے جب بارود کی بو فضا سے ختم ہو چکی ہوتی ہے، جب سرکاری بیانات سرکاری ریکارڈ بن چکے ہوتے ہیں، اور جب خفیہ دستاویزات آہستہ آہستہ منظرِ عام پر آنا شروع ہوتی ہیں۔ تب تاریخ ایک ایسا سوال اٹھاتی ہے جو ہر دور میں طاقت کے ایوانوں کو بے چین کرتا آیا ہے: کیا یہ جنگ واقعی ناگزیر تھی، یا اسے ناگزیر بنا کر پیش کیا گیا تھا؟

اسی سوال نے گزشتہ چند برسوں میں ایران کے حوالے سے ہونے والی کشیدگی کو بھی ایک نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور کیا ہے۔ جنگ ختم ہو چکی ہے، لیکن اس کے گرد تشکیل پانے والا بیانیہ، اس کے قانونی جواز، اس کے سیاسی محرکات اور اس کے اخلاقی مضمرات آج بھی بحث کا موضوع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بحث کو محض ایک علاقائی تنازع سمجھنا درست نہیں ہوگا؛ یہ دراصل جدید عالمی سیاست کے اس مستقل رویے کا حصہ ہے جس میں طاقت کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے لیے ایک اخلاقی اور قانونی جواز بھی تراشا جاتا ہے۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر جنگ کے دوران سب لوگ یکساں نہیں سوچتے۔ طاقت کے مراکز کے اندر بھی ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو سرکاری بیانیے سے اختلاف کرتے ہیں، سوال

اٹھاتے ہیں، اور کبھی کبھی اپنے منصب، اپنے مستقبل اور اپنی آسائش کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی آوازیں اکثر شور میں دب جاتی ہیں، لیکن وقت گزرنے کے بعد یہی آوازیں تاریخ کے صفحات میں سب سے زیادہ معتبر گواہ بن کر سامنے آتی ہیں۔

ایران اور امریکہ کی حالیہ کشیدگی کے دوران بھی امریکی قومی ادارہ برائے انسدادِ دہشت گردی (National Counterterrorism Center NCTC) کے ڈائریکٹر جو کینٹ (Joe Kent) کا استعفا اسی نوعیت کا ایک واقعہ تھا۔ انہوں نے اپنے مؤقف میں اس خیال سے اختلاف کیا کہ ایران امریکہ کے لیے کوئی ایسا "قریب الوقوع خطرہ" تھا جو جنگ کو ناگزیر بنا دیتا۔ ایک ایسے شخص کی یہ رائے، جو امریکی قومی سلامتی کے نظام کا حصہ رہا ہو، محض ایک انتظامی اختلاف نہیں بلکہ ضمیر کی گواہی کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ تاریخ میں ایسے واقعات اس لیے اہم ہوتے ہیں کہ وہ ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ ریاستی ادارے کبھی بھی ایک ہی آواز پر مشتمل نہیں ہوتے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے خطے میں بعض حلقوں نے ایران اور امریکہ کے تعلقات کو ایک ایسے سادہ اور سطحی تصور میں قید کر دیا ہے جس کے مطابق گویا دونوں ایک دوسرے کے حقیقی حریف نہیں بلکہ پسِ پردہ اتحادی ہیں، یا یہ کہ امریکہ کبھی ایران کو حقیقی نقصان پہنچانا ہی نہیں چاہتا۔ اس قسم کے تصورات جذباتی نعروں میں تو کشش رکھتے ہیں، لیکن تاریخ کے ریکارڈ پر پورا نہیں اترتے۔

اگر کوئی شخص گزشتہ سات دہائیوں کی تاریخ کو غیر جانب داری سے پڑھے تو اسے معلوم ہوگا کہ ایران اور امریکہ کے تعلقات وقتی سیاسی اتار چڑھاؤ کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل، پیچیدہ اور تلخ تاریخی عمل کی پیداوار ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے صرف حالیہ واقعات کافی نہیں، بلکہ ہمیں تاریخ کے ان صفحات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جہاں اس کشیدگی کی جڑیں پیوست ہیں۔

امریکی مؤرخ اسٹیفن کنزر (Stephen Kinzer) کی معروف کتاب All the Shah's Men اسی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہمارے سامنے کھولتی ہے۔ کنزر نے دستاویزی شواہد کی بنیاد پر یہ واضح کیا ہے کہ 1953ء میں امریکی سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس نے مشترکہ کارروائی کے ذریعے ایران کے جمہوری طور پر منتخب وزیرِ اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کارروائی کا مقصد صرف ایک حکومت کو تبدیل کرنا نہیں تھا، بلکہ ایران کے تیل پر مغربی مفادات کا تحفظ بھی اس کے پس منظر میں موجود تھا۔

ڈاکٹر محمد مصدق کا "جرم" یہ تھا کہ انہوں نے ایران کے قدرتی وسائل کو قومی ملکیت میں لے کر یہ اعلان کیا کہ کسی آزاد ریاست کے وسائل پر غیر ملکی طاقتوں کا مستقل قبضہ قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اس فیصلے نے برطانیہ کے معاشی مفادات کو چیلنج کیا، اور بعدازاں سرد جنگ کے ماحول میں اسے کمیونزم کے خطرے سے جوڑ کر امریکہ کو بھی مداخلت پر آمادہ کرلیا گیا۔

اسٹیفن کنزر کی تحقیق صرف ایک تاریخی واقعہ بیان نہیں کرتی بلکہ ایک مستقل سیاسی طریقۂ کار کی نشاندہی کرتی ہے؛ یعنی جب بھی کسی ملک میں معاشی یا سیاسی مفادات خطرے میں پڑتے ہیں تو ان کے گرد ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے جو مداخلت کو اخلاقی فریضہ، سلامتی کی ضرورت یا عالمی امن کا تقاضا بنا کر پیش کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ 1953ء کی ایرانی بغاوت کو صرف ماضی کا ایک واقعہ سمجھنا درست نہیں ہوگا۔ اس کے بعد عراق، افغانستان، لیبیا اور دیگر خطوں میں پیش آنے والے واقعات کو دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے کردار بدلتی ہے، لیکن اسکرپٹ اکثر وہی رہتا ہے۔

اگر جنگوں کا جائزہ صرف عسکری کامیابیوں اور سیاسی نتائج کی بنیاد پر لیا جائے تو شاید بہت سی مداخلتیں درست محسوس ہونے لگیں۔ لیکن جب انہی جنگوں کو تاریخ، بین الاقوامی قانون اور انسانی ضمیر کے پیمانے پر پرکھا جاتا ہے تو منظرنامہ یکسر بدل جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جنگ کے آغاز میں جو دلائل ناقابلِ تردید محسوس ہوتے تھے، چند برس بعد خود انہی پر سب سے زیادہ سوالات اٹھنے لگے۔

عراق: جب "تباہ کن ہتھیار" غائب ہوگئے سن 2003ء میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر حملے کا بنیادی جواز یہ پیش کیا کہ صدام حسین کی حکومت کے پاس Weapons of Mass Destruction-WMD موجود ہیں۔ دنیا کو بتایا گیا کہ عراق ایسے کیمیائی اور ممکنہ طور پر جوہری ہتھیار تیار کررہا ہے جو نہ صرف خطے بلکہ پوری دنیا کے لیے فوری خطرہ بن سکتے ہیں۔

یہ بیانیہ اتنی شدت سے پیش کیا گیا کہ عالمی رائے عامہ کا ایک بڑا حصہ اس جنگ کو ناگزیر سمجھنے لگا۔ لیکن جنگ کے بعد، جب عراق کے طول وعرض میں مہینوں تک تلاش کی گئی، تو وہ ہتھیار کبھی برآمد نہ ہوسکے جنہیں اس جنگ کا بنیادی جواز بنایا گیا تھا۔

بعد میں سامنے آنے والی امریکی اور برطانوی تحقیقاتی رپورٹس نے اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ جنگ سے پہلے فراہم کی جانے والی انٹیلی جنس معلومات یا تو ناقص تھیں، یا ان کی تشریح میں مبالغہ

کیا گیا تھا۔ یوں ایک ایسا بیانیہ، جس نے لاکھوں انسانوں کی تقدیر بدل دی، خود تاریخ کے سامنے کمزور پڑ گیا۔

یہ سوال آج بھی باقی ہے کہ اگر وہ خطرہ واقعی موجود نہیں تھا تو کیا اس جنگ کو روکا جا سکتا تھا؟

افغانستان: دہشت گردی کے خلاف جنگ یا ایک نہ ختم ہونے والا تنازع؟

11 ستمبر 2001ء کے حملوں کے بعد امریکہ نے افغانستان میں فوجی کارروائی کا آغاز کیا۔ اس کارروائی کا قانونی اور اخلاقی جواز القاعدہ کے خلاف کارروائی اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری تھا۔ ابتدا میں دنیا کی بڑی تعداد نے اس اقدام کو دہشت گردی کے خلاف ایک جائز ردِ عمل سمجھا۔

لیکن چند ہفتوں کی کارروائی کے طور پر شروع ہونے والی جنگ تقریباً دو دہائیوں پر محیط ایک طویل تنازع میں تبدیل ہوگئی۔ ہزاروں فوجی، لاکھوں افغان شہری، کھربوں ڈالر کے اخراجات، اور بالآخر 2021ء میں وہی طالبان دوبارہ اقتدار میں آ گئے جنہیں ہٹا کر یہ جنگ شروع کی گئی تھی۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ دہشت گردی کے خلاف کارروائی ضروری تھی یا نہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ کیا جنگ اپنے اعلان کردہ مقاصد حاصل کر سکی؟ اگر نتیجہ وہی نکلا جہاں سے سفر شروع ہوا تھا تو تاریخ لازماً اس حکمتِ عملی کا دوبارہ جائزہ لے گی۔

لیبیا: انسانی تحفظ کے نام پر ایک ریاست کا انہدام

2011ء میں لیبیا میں نیٹو کی فوجی مداخلت کو "Responsibility to Protect" کے اصول کے تحت جائز قرار دیا گیا۔ دنیا کو بتایا گیا کہ اگر فوری اقدام نہ کیا گیا تو بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کا نقصان ہوگا۔

فوجی کارروائی نے معمر قذافی کی حکومت کا خاتمہ تو کر دیا، لیکن اس کے بعد لیبیا ایک مستحکم اور پرامن ریاست بننے کے بجائے مسلسل خانہ جنگی، مسلح گروہوں، سیاسی تقسیم اور ادارہ جاتی انہدام کا شکار ہو گیا۔

یہ واقعہ ایک بار پھر یہی سوال سامنے لاتا ہے کہ اگر کسی مداخلت کا اخلاقی مقصد انسانی جانوں کا تحفظ ہو، لیکن اس کے نتائج ایک پورے معاشرے کو طویل عدم استحکام میں دھکیل دیں، تو تاریخ اس مداخلت کا فیصلہ کس بنیاد پر کرے گی؟

بین الاقوامی قانون اور "قریب الوقوع خطرہ"

بین الاقوامی نظام میں جنگ کے جواز کا سب سے بنیادی اصول اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 51 میں بیان کیا گیا ہے۔اس کے مطابق کسی ریاست کو یک طرفہ فوجی طاقت استعمال کرنے کا حق بنیادی طور پر دو صورتوں میں حاصل ہوتا ہے: یا اس پر بالفعل مسلح حملہ ہو چکا ہو، یا ایسا واضح اور قریب الوقوع خطرہ موجود ہو جسے ٹالنا ممکن نہ ہو۔

اسی لیے بین الاقوامی قانون میں Imminent Threat، یعنی" قریب الوقوع خطرہ"، محض ایک سیاسی اصطلاح نہیں بلکہ ایک قانونی معیار ہے۔اگر اس معیار کی تشریح سیاسی مفادات کے تابع ہو جائے تو پھر دنیا کا کوئی بھی ملک کسی بھی وقت کسی دوسرے ملک کو اپنے لیے ممکنہ خطرہ قرار دے کر جنگ کا آغاز کر سکتا ہے۔اس صورت میں بین الاقوامی قانون اپنی اخلاقی بنیاد کھو بیٹھتا ہے۔

اسی وجہ سے گزشتہ دو دہائیوں میں متعدد قانونی ماہرین نے عراق، لیبیا اور دیگر فوجی مداخلتوں کے قانونی جواز پر سنجیدہ سوالات اٹھائے ہیں۔اختلاف صرف سیاسی نہیں بلکہ اصولی بھی ہے، کیونکہ قانون کی قوت اسی وقت باقی رہتی ہے جب اس کا اطلاق طاقتور اور کمزور، دونوں پر یکساں ہو۔

بیانیہ اور حقیقت کے درمیان تاریخ کے ان تمام ابواب میں ایک قدرِ مشترک نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ہر جنگ سے پہلے ایک ایسا بیانیہ تشکیل دیا گیا جس نے خوف کو دلیل، شبہے کو یقین، اور امکان کو فوری خطرہ بنا کر پیش کیا۔لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، سرکاری بیانیے اور تاریخی حقیقت کے درمیان فاصلہ واضح ہوتا گیا۔

یہاں ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ہمارے اپنے معاشروں میں بھی بعض اوقات سیاسی وابستگیاں، مسلکی تعصّبات یا نظریاتی ترجیحات اتنی غالب آ جاتی ہیں کہ ہم تاریخ کو اپنی خواہش کے مطابق پڑھنے لگتے ہیں۔ایران کے حوالے سے بھی بعض حلقوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ امریکہ اور ایران کی کشمکش محض ایک ڈراما ہے، یا دونوں درحقیقت ایک ہی منصوبے کا حصہ ہیں۔

لیکن اگر 1953ء میں ڈاکٹر محمد مصدق کی منتخب حکومت کے خلاف ہونے والی امریکی و برطانوی مداخلت، اس کے بعد ربع صدی تک شاہ کی آمریت کی سرپرستی، 1979ء کے انقلاب کے بعد مسلسل کشیدگی، معاشی پابندیوں، سفارتی تصادم اور مختلف عسکری بحرانوں کو ایک تاریخی تسلسل میں دیکھا جائے تو یہ سادہ بیانیہ حقیقت کی پیچیدگیوں کا احاطہ نہیں کرتا۔

سیاسی اختلافات اپنی جگہ، مذہبی یا فقہی تنقید اپنی جگہ، لیکن تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ریاستوں کے تعلقات کو محض جذباتی نعروں یا نظریاتی پسند و ناپسند کے ترازو میں نہیں تولا جا

سکتا۔ سنجیدہ تجزیہ ہمیشہ شواہد، تاریخی تسلسل اور بین الاقوامی سیاست کے حقائق کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

اسی لیے کسی بھی جنگ یا کشیدگی کا جائزہ لیتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ طاقت کے مراکز کیا کہہ رہے ہیں، لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ دیکھنا ہے کہ ان مراکز کے اندر سے کون سی آوازیں اختلاف کر رہی ہیں۔ اکثر یہی آوازیں بعد میں تاریخ کی معتبر شہادت بن جاتی ہیں۔

ضمیر کی آواز اور تاریخ کا فیصلہتاریخ کا ایک عجیب مزاج ہے کہ وہ صرف فاتحین کے فیصلے محفوظ نہیں رکھتی، بلکہ ان آوازوں کو بھی یاد رکھتی ہے جو طاقت کے شور میں ضمیر کی بات کرتی ہیں۔

ایران کے حوالے سے حالیہ کشیدگی کے دوران امریکی قومی سلامتی کے ادارے نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم سینٹر (NCTC) کے سربراہ جو کینٹ (Joe Kent) کا استعفا اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے شخص کی طرف سے جنگی جواز پر سوال اٹھانا، جو خود امریکی سلامتی کے نظام کا حصہ رہا ہو، اس بات کی یاد دہانی ہے کہ ریاستی اداروں کے اندر بھی ایسے افراد موجود ہوتے ہیں جو فیصلوں کو صرف طاقت اور مفاد کے زاویے سے نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری کے آئینے میں بھی دیکھتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جنگیں ختم ہو جاتی ہیں، لیکن ان کے جواز پر سوال باقی رہتے ہیں۔ عراق میں تباہ کن ہتھیاروں کا دعویٰ، افغانستان کی طویل جنگ، لیبیا کا بحران اور ایران کے ساتھ کشیدگی، یہ سب واقعات ایک ہی بنیادی سوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں: کیا جنگ واقعی ناگزیر تھی، یا اسے ناگزیر بنا کر پیش کیا گیا؟

اسٹیفن کنزر کی کتاب All the Shah's Men سے لے کر آج کے عالمی تنازعات تک ایک حقیقت واضح ہوتی ہے کہ طاقت صرف ہتھیاروں سے نہیں چلتی، بلکہ بیانیوں سے بھی چلتی ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ تاریخ ان بیانیوں کو بھی پرکھتی ہے اور ان کے پیچھے چھپے مفادات کو بھی سامنے لاتی ہے۔

آخر کار جنگوں کا فیصلہ صرف میدانِ جنگ میں نہیں ہوتا۔ میدان میں طاقت فیصلہ کرتی ہے، لیکن تاریخ کے کٹہرے میں سچائی، اخلاق اور ضمیر فیصلہ کرتے ہیں۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنے والی نسلیں ہمیشہ یہ سوال پوچھتی رہیں گی:

کیا یہ جنگ واقعی ضروری تھی، یا انسان کے پاس اسے روکنے کا کوئی راستہ موجود تھا؟

☆☆☆

عبداللہ ندیم

# عہدِ اطلاعات میں مسلم ذہن کا محاصرہ

بعض اوقات تاریخ اپنے رخ بدلنے کا اعلان کسی جنگ، انقلاب یا سلطنت کے زوال سے نہیں کرتی بلکہ خاموشی سے انسانی زندگی میں سرایت کر جاتی ہے۔ بعد میں جب مورخ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ اصل تبدیلی میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ انسانی ذہن کے اندر برپا ہوئی تھی۔ ہمارا زمانہ بھی شاید ایسی ہی ایک تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس بار جنگ سرحدوں پر نہیں بلکہ ذہنوں کے اندر لڑی جا رہی ہے، اور اس کے ہتھیار ٹینک اور توپیں نہیں بلکہ تصاویر، ویڈیوز، خبریں، ہیش ٹیگ، الگورتھم اور مصنوعی ذہانت ہیں۔

تاریخ میں طاقت کے مراکز بدلتے رہے ہیں۔ کبھی زمین طاقت تھی، پھر فوج طاقت کا ذریعہ بنی، صنعتی دور میں سرمایہ سب سے بڑا وسیلہ قرار پایا، لیکن اکیسویں صدی میں اطلاعات اور بیانیہ طاقت کی نئی شکل بن چکے ہیں۔ آج وہی زیادہ طاقت ور ہے جو لوگوں کو یہ باور کرا سکے کہ حقیقت کیا ہے، خطرہ کہاں ہے اور امید کس سے وابستہ کی جانی چاہیے۔

مارشل میکلوہن کا مشہور قول "The media is the message" آج کے دور کی ایک بڑی حقیقت بن چکا ہے۔ اب صرف پیغام اہم نہیں بلکہ وہ ذریعہ بھی اہم ہے جس کے ذریعے پیغام پہنچایا جاتا ہے۔ جس کے پاس ابلاغ کے ذرائع پر اثر و رسوخ ہو، وہ صرف خبریں نہیں دیتا بلکہ حقیقت کی تعبیر بھی متعین کرتا ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں میں سوشل میڈیا نے سیاست، صحافت اور سماجی تعلقات کی بنیادوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کبھی اخبارات رائے عامہ تشکیل دیتے تھے، پھر ٹیلی ویژن نے یہ کردار سنبھالا، اور آج ایک اسمارٹ فون رکھنے والا فرد بھی لاکھوں لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتا ہے۔ بظاہر یہ ایک جمہوری پیش رفت تھی، لیکن جلد ہی واضح ہو گیا کہ اس آزادی سے سچ بولنے والوں کے ساتھ ساتھ جھوٹ پھیلانے والوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔

یہی ہمارے عہد کا سب سے بڑا بحران ہے۔ جھوٹ ہمیشہ موجود رہا ہے، لیکن آج اس کی رفتار غیر معمولی ہو چکی ہے۔ ایک فرضی ویڈیو، سیاق سے کاٹی گئی تصویر یا من گھڑت اقتباس چند گھنٹوں میں کروڑوں افراد تک پہنچ سکتا ہے۔ سچائی کو تحقیق اور ثبوت درکار ہوتے ہیں، جبکہ جھوٹ کو صرف جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر ہندوستانی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو معاملہ مزید پیچیدہ نظر آتا ہے۔ صحافت کا بنیادی فریضہ اقتدار سے سوال کرنا، طاقت کے مراکز کا احتساب کرنا اور عوام کو غیر جانب دار معلومات فراہم کرنا تھا، لیکن رفتہ رفتہ میڈیا کے ایک بڑے حصے میں خبر اور رائے کا فرق کم ہوتا گیا۔ اب اکثر واقعات کے ساتھ ایک مخصوص زاویۂ نظر بھی پیش کیا جاتا ہے۔

یہ رجحان صرف ہندوستان تک محدود نہیں۔ عراق جنگ کے دوران "ایمبیڈڈ جرنلزم" کی اصطلاح سامنے آئی، جہاں بعض صحافی فوجی دستوں کے ساتھ رہ کر رپورٹنگ کر رہے تھے۔ بعد میں واضح ہوا کہ عراق میں تباہ کن ہتھیاروں کے بارے میں کیے گئے کئی دعوے بے بنیاد تھے، لیکن اس وقت تک جنگ شروع ہو چکی تھی۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ میڈیا کی جانبداری ایک عالمی مسئلہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے حوالے سے یہ صورت حال خاص طور پر تشویش ناک رہی ہے۔ نائن الیون کے بعد دنیا کے کئی حصوں میں اسلام اور دہشت گردی کے درمیان ایک مصنوعی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستان میں بھی اس بیانیے کو مقامی سیاسی حالات نے تقویت دی۔ رفتہ رفتہ مسلمان ایک شہری، ہمسایہ یا پیشہ ور فرد کے بجائے ایک سیاسی علامت کے طور پر پیش کیے جانے لگے۔

میڈیا مباحثوں میں مسلمانوں کا ذکر اکثر مسائل کے تناظر میں ہونے لگا؛ کبھی دہشت گردی، کبھی آبادی، کبھی مدارس، کبھی حجاب اور کبھی مساجد۔ ایک پوری کمیونٹی کو مسلسل دفاعی پوزیشن میں کھڑا کر دیا گیا۔ سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ مسلمان اکثر گفتگو کا موضوع تھے، شریکِ گفتگو نہیں۔

سوشل میڈیا نے اس صورت حال کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ واٹس ایپ گروپوں، فیس بک صفحات اور یوٹیوب چینلوں کی دنیا میں خبر اور افواہ کے درمیان فرق کم ہوتا گیا۔ جذبات نے حقائق پر غلبہ حاصل کیا اور تصدیق کی جگہ تاثر نے لے لی۔

کورونا وبا کے دوران تبلیغی جماعت کے خلاف چلائی گئی مہم اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ایک مخصوص اجتماع کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ گویا پورے ملک میں وبا کے پھیلاؤ کی ذمہ داری اسی

پر عائد ہوتی ہے۔ بعد میں کئی الزامات کمزور یا بے بنیاد ثابت ہوئے، لیکن عوامی ذہن پر جو اثر پڑنا تھا، وہ پڑ چکا تھا۔ اس واقعے نے دکھایا کہ جدید دور میں کردار کشی کے لیے ہمیشہ ثبوت کافی نہیں ہوتے، کبھی صرف ایک مؤثر بیانیہ ہی کافی ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں قائم کیے گئے اس بیانیے کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ زمینی حقائق اور عوامی تصورات کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ جدید سیاست اکثر حقائق سے زیادہ تصورات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لوگ ہمیشہ اس بنیاد پر ردِ عمل نہیں دیتے کہ حقیقت کیا ہے بلکہ اس بنیاد پر دیتے ہیں کہ انہیں حقیقت کے بارے میں کیا باور کرایا گیا ہے۔

ماب لنچنگ کے واقعات کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف چند مجرمانہ واقعات نہیں بلکہ ان کے سماجی اور نفسیاتی اثرات کہیں زیادہ گہرے ہیں۔ ایسے واقعات ایک بڑے طبقے میں خوف پیدا کرتے ہیں، اور یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ انصاف تک رسائی آسان نہیں۔

گزشتہ برسوں میں ایسے واقعات کے متاثرین سے گفتگو کا موقع ملا تو ایک چیز بار بار سامنے آئی: خوف۔ صرف جان کا خوف نہیں بلکہ انصاف سے محرومی کا خوف بھی۔ کئی لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کی تکلیف چند دن کی خبر بن کر رہ گئی۔

یہ سوال صرف اکثریتی معاشرے سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے بھی ہے کہ کیا ہم نے اپنے مسائل کو اپنی اجتماعی ترجیحات میں وہ مقام دیا جس کے وہ مستحق تھے؟

ہمیں فلسطین، شام اور دنیا کے دیگر مظلوموں کے لیے آواز اٹھانی چاہیے، لیکن ساتھ ہی اپنے محلوں، شہروں اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو بھی اسی سنجیدگی سے دیکھنا ہوگا۔ ایک زندہ قوم وہی ہوتی ہے جو عالمی مسائل پر نظر بھی رکھے اور مقامی حقیقتوں سے بھی غافل نہ ہو۔

گزشتہ کئی دہائیوں میں مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی قیادت نے بہت سے اہم کام انجام دیے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جدید دنیا کے تقاضوں کو سمجھنے میں وہ مطلوبہ رفتار سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ہماری قیادت کا ایک بڑا حصہ ابھی تک بیسویں صدی کے سوالات میں الجھا ہوا ہے، جبکہ دنیا اکیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں داخل ہو چکی ہے۔

آج کی دنیا میں صرف جلسے، جلوس اور قراردادیں کافی نہیں ہیں۔ جدید دور کے بڑے میدان میڈیا، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی، ڈیٹا، تحقیق اور بیانیہ سازی کے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان میدانوں

میں ہماری موجودگی بہت کمزور ہے۔

آج اگر کسی نوجوان سے پوچھا جائے کہ رائے عامہ کہاں تشکیل پاتی ہے تو وہ مسجد، جلسہ گاہ یا کانفرنس ہال کا نام نہیں لے گا بلکہ یوٹیوب، انسٹاگرام، ایکس، پوڈکاسٹ اور دیگر ڈیجیٹل پلیٹ فارموں کا ذکر کرے گا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ آج سیاسی موضوعات پہلے سوشل میڈیا پر جنم لیتے ہیں اور پھر بڑے اداروں تک پہنچتے ہیں۔

اردو صحافت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اردو اخبارات صرف خبریں فراہم نہیں کرتے تھے بلکہ فکری قیادت کا کردار بھی ادا کرتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان اور حسرت موہانی جیسے لوگوں نے صحافت کو محض پیشہ نہیں بلکہ ایک فکری ذمہ داری سمجھ کر اختیار کیا۔ محدود وسائل کے باوجود ان کی تحریریں پورے برصغیر میں اثر پیدا کرتی تھیں۔

آج اردو صحافت موجود تو ہے، لیکن اس کا فکری اور قومی اثر پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس کی ایک وجہ زبان کا مسئلہ ہے اور دوسری وجہ وژن کا بحران۔ نئی نسل کا اردو سے جذباتی تعلق تو باقی ہے، لیکن عملی اور فکری تعلق کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف اردو صحافت کا ایک بڑا حصہ اب بھی پرانے سانچوں میں سوچ رہا ہے، جبکہ دنیا کے ذرائع ابلاغ بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے پاس ایسا مؤثر میڈیا ادارہ کم ہی نظر آتا ہے جو قومی سطح پر ہندی اور انگریزی میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکے۔ دنیا آپ کے بارے میں کیا سوچتی ہے، اس کا فیصلہ صرف آپ کے حالات نہیں بلکہ آپ کی ابلاغی صلاحیت بھی کرتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے خلاف منفی بیانیوں کو چیلنج کرنے والے کئی اہم صحافی، ادارے اور پلیٹ فارم خود مسلم برادری سے تعلق نہیں رکھتے۔ آزاد صحافی، انسانی حقوق کے کارکن اور فیکٹ چیکنگ ادارے بعض ایسے کام کر رہے ہیں جو کسی حد تک ہمیں خود کرنے چاہیے تھے۔ اس حقیقت کو شکایت کے بجائے خود احتسابی کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں سب سے زیادہ گفتگو ہونے کے باوجود بیانیہ سازی کے میدان میں ان کی اپنی موجودگی کمزور کیوں ہے؟ اس کا جواب صرف وسائل کی کمی میں نہیں مل سکتا۔ وسائل اہم ضرور ہیں، لیکن وژن ان سے زیادہ اہم ہے۔ قومیں صرف سرمائے سے ترقی نہیں کرتیں، بلکہ اپنی ترجیحات کے ذریعے آگے بڑھتی ہیں۔

ہماری ایک بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم طویل عرصے تک دفاعی ذہنیت میں مبتلا رہے۔ دفاع بعض اوقات ضروری ہوتا ہے، لیکن مسلسل دفاع تخلیقی صلاحیتوں کو محدود کر دیتا ہے۔ جب ایک قوم کی زیادہ تر توانائی صرف الزامات کے جواب دینے میں صرف ہونے لگے تو وہ نئے ادارے بنانے اور نئے میدان فتح کرنے کی صلاحیت کھونے لگتی ہے۔

آج تعلیم صرف ڈگری کا نام نہیں، بلکہ فکری سرمایہ ہے۔ میڈیا صرف خبر رسانی نہیں بلکہ رائے عامہ کی تشکیل کا ذریعہ ہے، اور ٹیکنالوجی صرف سہولت نہیں بلکہ طاقت کا سرچشمہ ہے۔ ہمیں ان حقیقتوں کو سمجھنے میں تاخیر ہوئی ہے۔

کبھی کبھی دوسروں کی کامیابیوں سے بھی سیکھنا چاہیے۔ تاریخ میں ہر کامیاب قوم نے اپنے تجربات کے ساتھ دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ دنیا کے مختلف میدانوں میں بعض قوموں کی کامیابی کے پیچھے تعلیم، تحقیق، ادارہ سازی اور طویل مدتی منصوبہ بندی جیسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی جذباتی نعروں کے بجائے ان اسباب پر غور کرنا ہوگا۔

اب ایک نئی تبدیلی ہمارے سامنے ہے: مصنوعی ذہانت کا دور۔

اگر گزشتہ دو دہائیاں سوشل میڈیا کی تھیں تو آنے والا زمانہ مصنوعی ذہانت کا ہوگا۔ یہ ٹیکنالوجی علم، ابلاغ اور سیاست کی دنیا کو بنیادی طور پر بدلنے والی ہے۔ آج ایسی ویڈیوز، آوازیں اور تحریریں تیار کی جا سکتی ہیں جن میں حقیقت اور نقل کا فرق مشکل ہو جائے۔ مستقبل کا بڑا خطرہ صرف جھوٹ نہیں بلکہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے لیے سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا مشکل ہو جائے۔

ایسے ماحول میں وہی معاشرے کامیاب ہوں گے جن کے پاس مضبوط ادارے، معتبر ذرائع، تحقیق کرنے والے افراد اور جدید ٹیکنالوجی سے واقف نسل موجود ہوگی۔

یہاں پھر سوال ہماری طرف لوٹتا ہے:

کیا ہم آنے والی دنیا کے لیے تیار ہیں؟

کیا ہمارے پاس ایسے تحقیقی ادارے ہیں جو میڈیا اور ٹیکنالوجی کے نئے رجحانات کا مطالعہ کر رہے ہوں؟

کیا ہمارے پاس ایسے میڈیا پلیٹ فارم ہیں جو وسیع سطح پر اثر پیدا کر سکیں؟

کیا ہماری تعلیمی اور سماجی تنظیمیں نوجوانوں کو فکری قیادت کے لیے تیار کر رہی ہیں؟

ان سوالات کے جوابات شاید ابھی بہت حوصلہ افزا نہیں، لیکن مایوسی بھی کوئی راستہ نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قومیں اس وقت بدلتی ہیں جب وہ اپنے مسائل کی درست تشخیص کر لیتی ہیں۔

ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ مسئلہ صرف میڈیا کا نہیں، ذہن کا ہے۔ مسئلہ صرف نمائندگی کا نہیں، قابلیت کا ہے۔ مسئلہ صرف شکایت کا نہیں، تیاری کا ہے۔ اگر مسلمان اپنی اجتماعی صورت حال بہتر بنانا چاہتے ہیں تو انہیں چند بنیادی ترجیحات طے کرنا ہوں گی:

تعلیم کو فکری سرمایہ بنانا ہوگا۔ صحافت اور ابلاغ کو سنجیدہ سماجی ذمہ داری کے طور پر اختیار کرنا ہوگا۔ ہندی، انگریزی اور دیگر مؤثر زبانوں میں مہارت پیدا کرنی ہوگی۔ ڈیجیٹل میڈیا، فلم، تحقیق، ڈیٹا جرنلزم اور مصنوعی ذہانت جیسے میدانوں میں سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔ اور سب سے بڑھ کر ردِ عمل کی نفسیات سے نکل کر تخلیق اور تعمیر کی نفسیات اختیار کرنی ہوگی۔

دنیا میں کوئی قوم صرف اس لیے باعزت مقام حاصل نہیں کرتی کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ عزت اس قوم کو ملتی ہے جو مشکلات کے باوجود اپنے اندر امکانات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

آج کی اصل جنگ زمینوں یا سرحدوں کی نہیں بلکہ ذہنوں کی ہے۔ جو قومیں اس جنگ کی حقیقت کو سمجھ لیں گی اور اس کے لیے خود کو تیار کر لیں گی، مستقبل انہی کا ہوگا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَار

☆☆☆

خبیب کاظمی

# وہ چراغِ سحر تھا، بجھ گیا مگر روشنی باقی ہے

بعض نفوسِ قدسیہ دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہوتے؛ ان کا وجود خود اپنی دلیل ہوتا ہے اور ان کی زندگی وقت کے سینے پر ایسا نقش چھوڑ جاتی ہے جسے مٹانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ تاریخ کے اوراق میں نہیں بلکہ انسانوں کے دلوں میں نقش رہتے ہیں، اینٹ گارے کے اداروں میں نہیں بلکہ بیدار ذہنوں کی یادوں میں سانس لیتے ہیں۔

قاری محمد عرفان شمسیؒ بھی ایسے ہی ایک چراغِ سحر تھے؛ وہ چراغ جو تاریکیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے رات بھر خود کو جلاتا ہے، مسافروں کو منزل کا سراغ دیتا ہے، اور جب صبح کا اجالا کائنات کو اپنی آغوش میں لینے لگتا ہے تو خاموشی سے بجھ جاتا ہے۔ مگر اس کی خاموشی اندھیرے کی بازگشت نہیں ہوتی بلکہ اس نور کا تسلسل ہوتی ہے جو وہ سحر کے سپرد کر کے رخصت ہوتا ہے۔

یہ داستانِ شوق اسی چراغِ سحر کی ہے جس نے علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، جس کی قرآنی صداؤں نے دلوں کو گرمایا، آنکھوں کو نم کیا اور بے شمار لوگوں کے اندر ایمان و یقین کی نئی روشنی پیدا کی۔ اس نے دعوت، خدمت اور اخلاص کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا تھا۔

ان کے وصال کے وقت بظاہر کئی علمی منصوبے ادھورے رہ گئے اور کئی خواب تعبیر کے منتظر تھے، مگر جو روشنی وہ چھوڑ گئے وہ آج بھی راہوں کو منور کر رہی ہے اور آنے والوں کو راستہ دکھا رہی ہے۔

## بستانِ علم کا پہلا شگوفہ... رامپور سے فلاح تک

۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو رامپور کی تاریخی اور علمی سرزمین پر ایک ایسے طفلِ سعادت مند نے آنکھ کھولی، جسے آگے چل کر قراءت، علم اور دعوتِ دین کا استعارہ بننا تھا۔

تخلیقِ کائنات کے اس شاہکار کی تشنہ لبی نے سب سے پہلے مدرسہ تجوید القرآن کے چشمۂ صافی کا رخ کیا، جہاں انہوں نے قرآن کریم کو اپنے سینے میں محفوظ کیا۔ اسی معصومانہ دور میں انہیں

قاری عبدالواحد رامپوری صاحب جیسی یگانۂ روزگار ہستی سے سندِ قراءت حاصل کرنے کا شرف ملا۔ یہ ان کے مستقبل کی پہلی مضبوط بنیاد تھی۔

علم کی یہ تڑپ انہیں جامعۃ الفلاح کی دہلیز تک لے آئی۔ فلاح کے زیتونی ماحول میں انہوں نے سات برس گزارے۔ یہ صرف سات سال نہیں، بلکہ یہ ان کی شخصیت کی تراش خراش کا سنہری دور تھا۔ یہیں ان کے علمی ذوق کو جلا ملی، ان کا قرآنی اسلوب نکھرا، اور خدمتِ خلق کا جذبہ ان کی رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ وہ اپنے دور میں جامعۃ الفلاح کے ان مایہ ناز طلبہ میں شمار ہوتے تھے، جن کی سحر انگیز آواز، وسیع مطالعہ اور باوقار قراءت اساتذہ اور طلبہ دونوں کے حلقوں میں رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔

## قاہرہ کے افق پر فلاح کا سفیر... ازہر کی تاریخی دہلیز پر

جامعۃ الفلاح کے علمی حصار سے نکل کر جب انہوں نے نیل کے کنارے آباد جامعہ ازہر (قاہرہ) کا رخ کیا تو یہ صرف ایک طالب علم کی ہجرت نہیں تھی بلکہ ایک نئے علمی ارتقاء کا سنگِ میل تھا۔

وہ جامعۃ الفلاح کے اُن اولین فضلاء میں شامل تھے جنہوں نے جامعہ ازہر کی تاریخی درسگاہ میں داخلہ حاصل کیا، اور اس اعتبار سے جامعۃ الفلاح کے دوسرے ازہری تھے۔ قاہرہ کے اجنبی ماحول، فصیح عربی کے معرکہ آرا میدانوں اور منفرد نظامِ تعلیم میں انہوں نے جلد اپنی علمی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔

جامعۃ الفلاح سے ان کی وابستگی صرف ایک سابق طالب علم کی حد تک نہ تھی، بلکہ وہ اس ادارے کی علمی ترقی اور وقار کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ جامعہ ازہر سے جامعۃ الفلاح کے روابط، اس کی اسناد کے معادلے اور ادارے کی علمی شناخت کو مضبوط بنانے کے سلسلے میں وہ دلچسپی لیتے رہے اور حسبِ استطاعت اپنی کوششیں بھی جاری رکھیں، تاکہ آنے والے طلبہ کے لیے علمی مواقع مزید ہموار ہو سکیں۔

## وہ لحنِ داؤدی جس نے مصر کو مسحور کر دیا

مصر، جو صدیوں سے حسنِ قراءت اور فنِ تلاوت کا مرکز ہے، وہاں ہندوستان کے اس نوجوان نے اپنی آواز کا ایسا سحر جگایا کہ اہلِ مصر بھی معترف ہو گئے۔ اسکندریہ کے عالمی قراءت کے مقابلے میں انہوں

نے پہلی پوزیشن حاصل کی اور غیر معمولی اعزاز سے نوازے گئے۔اس شاندار کامیابی کے اعتراف میں اُس وقت کے مصری وزیرِ اعظم نے ایک خصوصی تقریب میں انہیں اعزاز اور حجِ بیت اللہ کے ٹکٹ سے نوازا۔

اسی سال ان کی علمی و تعلیمی میدان میں بھی غیر معمولی کارکردگی کا اعتراف کیا گیا اور انہیں یونیورسٹی کی طرف سے " مثالی طالب علم" (Ideal Student) کے باوقار اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ دونوں کامیابیاں دو الگ پہلو رکھتی تھیں: ایک قراءت کی دنیا میں امتیاز، اور دوسرا تعلیمی میدان میں علمی برتری۔

لیکن ان کی اصل عظمت محض خوش الحانی یا فنی مہارت تک محدود نہ تھی، بلکہ ان کی قراءت سوز و تاثیر کا پیکر تھی۔ وہ قرآن کو صرف پڑھتے نہیں تھے بلکہ اسے محسوس کرتے اور سامعین کو بھی اس کیفیت میں شریک کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تلاوت سماعت سے زیادہ دلوں پر اثر کرتی تھی۔

ان کی تقریروں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جب قرآن کی کوئی آیت یا سیرتِ نبوی ﷺ کا کوئی ایمان افروز واقعہ بیان کرتے تو محسوس ہوتا کہ وہ صرف ایک مقرر نہیں بلکہ ایک صاحبِ دل انسان ہیں جو پہلے خود اس کیفیت سے گزرتے ہیں، پھر سامعین کو اس میں شریک کر لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی گفتگو سننے والے صرف معلومات حاصل نہیں کرتے تھے بلکہ قرآن اور سیرت کو اپنے دل کی دنیا میں محسوس بھی کرتے تھے۔

ان کی خوش الحانی اور اثر انگیزی کا چرچا مصر تک محدود نہ تھا۔ جامعۃ الفلاح کے اُن ایام کو یاد کرتے ہوئے معاصرین بیان کرتے ہیں کہ جب مغرب کی اذان کا وقت ہوتا اور کھیل کے میدانوں میں مصروف طلبہ کو نماز کے لیے بلانا مقصود ہوتا تو بالخصوص انہی سے اذان دلوائی جاتی تھی۔ جونہی ان کی پُرسوز آواز فضا میں بلند ہوتی، میدانوں میں کھیلتے ہوئے بچے اور نوجوان بے اختیار مسجد کی طرف دوڑ پڑتے۔ گویا یہ صرف اذان نہ تھی بلکہ روح کی گہرائیوں سے ابھرنے والی وہ صدا تھی جو دلوں کو اپنے رب کی بارگاہ کی طرف کھینچ لاتی تھی۔

بعد کے برسوں میں قطر میں بھی جب وہ تلاوت کرتے یا قرآن سناتے تو سامعین ان کی قراءت کے سوز، حسنِ ادائیگی اور روحانی اثر کا خصوصی ذکر کرتے تھے۔ یہ وہ نعمت تھی جو اللہ تعالیٰ ہر کسی کو عطا نہیں کرتا، ایک ایسی آواز جو کانوں سے زیادہ دلوں کو سنائی دیتی تھی۔

ان کا علمی سفر محض قراءت کی حد تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ علم کی گہرائیوں میں اترنے والے ایک سچے غواص تھے۔ انہوں نے جامعہ ازہر کے "کلیہ اصول الدین" سے تفسیر وحدیث کے شعبے میں تعلیم حاصل کی اور جید جداً (First Class) کے اعلیٰ ترین درجے کے ساتھ لیسانس (گریجویشن) کی ڈگری حاصل کی۔

ان کا علمی ملکہ اس وقت مزید کھل کر سامنے آیا جب انہوں نے ایم اے کے لیے "سورۃ النازعات و بیان اھدافھا" کے عنوان سے ایک گراں قدر اور اچھوتا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ مصری اساتذہ اور ممتحنین نے ان کی باریک بینی اور اسلوبِ نگارش کی داد دیتے ہوئے اس مقالے کو "ممتاز" (Excellent) کے درجے سے نوازا۔ وہ پی ایچ ڈی کے آخری مراحل میں داخل ہو کر علم کی معراج کو چھونے ہی والے تھے کہ مشیتِ ایزدی نے ان کی زندگی کا رخ ایک دوسرے میدان کی طرف موڑ دیا۔

## دوحہ... جہاں ایک فرد ادارہ بن گیا

۱۹۸۳ء ان کی زندگی میں ایک انقلابی موڑ ثابت ہوا جب وہ حجِ بیت اللہ کی سعادت کے لیے ارضِ مقدس حاضر ہوئے۔ یہ ان کا دوسرا حج تھا، جو دراصل مصر کے عالمی مسابقۂ قراءت میں پہلی پوزیشن کے اعتراف میں حکومتِ مصر کی طرف سے بطورِ انعام عطا ہوا تھا۔

حج ہی کے دوران ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالعزیز بن بازؒ کے دفتر میں انہیں آفس سیکریٹری کی ذمہ داری سونپی گئی، اور یوں ایک سال تک مکہ، طائف اور ریاض میں شیخ محترم کی قربت اور خدمت کا نادر موقع ملا۔ یہ رفاقت ان کی علمی، دعوتی اور فکری شخصیت کے لیے غیر معمولی نکھار اور پختگی کا ذریعہ بنی۔

انہی ایام میں رابطہ عالمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحیؒ اور مرکزی سیکریٹری سید یوسفؒ صاحب مکہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ اتفاق سے انھیں دنوں میں شیخ ابن بازؒ نے دعوتی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے قاری صاحب کو دو مقامات، لندن اور قطر کی طرف توجہ دلائی۔

قطر کے ذکر پر سید یوسفؒ صاحب نے نہایت اعتماد کے ساتھ مشورہ دیا کہ وہاں جماعت کا مضبوط حلقہ موجود ہے، اس لیے انہیں وہاں منتقل ہو جانا چاہیے۔ ساتھ ہی انہوں نے، قطر میں تحریک

اسلامی کے مؤسس جناب وحید داد خان، اپنے بھائی یعقوب شاہ میاں کے نام تعارفی خطوط بھی لکھے، جو قطر میں اسلامی تحریک کے ابتدائی معماروں میں شمار ہوتے تھے۔

۱۹۸۴ء کے اواخر میں جب وہ قطر پہنچے تو جناب عبدالوحید داد خانؒ اور سید یعقوب شاہ میاں نے نہ صرف ان کا پرتپاک استقبال کیا بلکہ انہیں اپنے اہلِ خانہ کا فرد بنالیا۔ ابتدائی ایام میں رہائش، تعارف، دعوتی سرگرمیوں اور سماجی روابط کے ہر مرحلے میں دونوں بزرگوں کی شفقت ان کے شاملِ حال رہی۔ یہ تعلق رسمی رفاقت تک محدود نہ رہا بلکہ تاحیات ایک خانوادۂ محبت کی صورت قائم رہا۔

اس طرح چند ہی دنوں میں یہ سرزمین ان کے لیے اجنبی نہیں رہی۔ یہی وہ ابتدائی بنیاد تھی جس پر بعد کے برسوں میں جماعت اسلامی، اہل حدیث اور تبلیغی جماعت سمیت مختلف دینی حلقوں میں ان کی غیر معمولی مقبولیت قائم ہوئی۔

قطر میں ان کی خدمات ایک فرد کی سطح تک محدود نہ رہیں۔ مرکز الدعوۃ والارشاد میں وہ دینی رہنمائی، تدریس اور علمی مشاورت کے ساتھ ساتھ اردو داں طبقے کے ایک معتبر علمی مرجع بن گئے۔

ریڈیو قطر FM107 کے پروگرام "نورِ اسلام" سے ان کا ۱۷ سالہ تعلق انہیں خطے بھر میں گھر گھر متعارف کر گیا۔ لائیو پروگراموں میں وہ فقہی، سماجی اور خاندانی مسائل کا نہایت مدلل، نرم اور شفقت آمیز انداز میں جواب دیتے، جس سے لاکھوں سامعین کی علمی پیاس بجھتی رہی۔ اسی طرح جمعہ کے خطبات کے اردو تراجم کے ذریعے وہ نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقے کے لیے علمی و روحانی کشش کا مرکز بن گئے۔ البِدع کی مسجد میں ان کی گفتگو ترجمہ سے زیادہ بلکہ فکر و روح کی تازگی کا ذریعہ ہوتی تھی۔

دعوت و تدریس کے ساتھ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت بھی ان کی زندگی کا اہم مشن تھا۔ ان کی صحبت سے بے شمار نوجوانوں نے قرآن فہمی، دینی شعور اور فکری پختگی حاصل کی۔ ان کی گفتگو علم و آگہی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کا سلیقہ بھی عطا کرتی تھی۔ ان کی خطابت کا خاصہ یہ تھا کہ وہ جذباتی خطیب نہیں تھے؛ ان کی گفتگو مستند حوالوں، علمی تحقیق اور مضبوط دلائل پر قائم ہوتی تھی۔ وہ جذبات کو علم کے تابع رکھتے تھے، جس کی وجہ سے عام سامع کے ساتھ اہلِ علم بھی ان کی محفلوں میں برابر شریک رہتے تھے۔

ان کی خطابت کی ایک امتیازی خصوصیت ان کی زبان بھی تھی۔ ان کی اردو نہ صرف شستہ اور ٹکسالی تھی بلکہ اس میں ادبی وقار، محاورے کی صحت اور لہجے کی لطافت نمایاں تھی۔ ان کی گفتگو میں نہ

علاقائی رنگ غالب آتا تھا اور نہ کسی مصنوعی خطابت کا شائبہ۔ وہ نہایت سلیس، باوقار اور ادیبانہ انداز میں گفتگو کرتے، جس کی وجہ سے اہلِ علم، ادباء اور عام سامع سب یکساں طور پر ان کی زبان کے حسن سے متاثر ہوتے تھے۔

علمی اور فکری نشستوں کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ سرگرم رہے۔ محترم عبد الوحید داد خان صاحب اور دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر علمی حلقوں، فکری نشستوں اور مطالعۂ قرآن کی مجالس کو منظم کرتے رہے، تاکہ نئی نسل کتاب اور فکر سے اپنا رشتہ مضبوط رکھ سکے۔

یوں وہ بتدریج ایک فرد سے بڑھ کر ایک ایسا علمی و دعوتی مرکز بن گئے جس کے گرد علم، تربیت، اخوت اور خیر خواہی کے دائرے تشکیل پاتے گئے۔ ان سے ملنے والا ہر شخص کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتا تھا... علمی رہنمائی، روحانی سکون، اخلاقی سبق یا زندگی کا نیا حوصلہ۔

## خاموش قلم کار... بکھرے ہوئے موتی اور یادوں کے اثاثے

قاری صاحب کی شخصیت کا ایک نہایت اہم، مگر نسبتاً غیر معروف پہلو ان کی تحریری و تحقیقی خدمات تھیں۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں پر یکساں دسترس نے ان کے قلم کو ایک مستقل روانی عطا کر رکھی تھی۔ وہ محض خطیب یا معلم نہیں تھے، بلکہ ایک ایسے خاموش قلم کار بھی تھے جو علمی موضوعات پر مضامین، خطبات کے فکری خاکے اور تحقیقی نکات تسلسل کے ساتھ محفوظ کرتے رہتے تھے۔

مرکز الدعوۃ والارشاد کے تحت ان کی ایک مستقل ذمہ داری تھی کہ وہ ہر ماہ ایک اردو اور ایک عربی مضمون تحریر کریں۔ یہ مضامین وہ نہایت محنت، توجہ اور ذاتی کاوش سے اپنے ہاتھ سے لکھتے، اور ان کی فائلیں ترتیب دیتے جاتے تھے۔ یوں تقریباً بارہ برس کے عرصے میں ایک ایسا قیمتی علمی ذخیرہ تیار ہو چکا تھا جسے اگر محفوظ رہتا تو باقاعدہ ایک یا ایک سے زائد ضخیم کتابوں کی صورت میں شائع کیا جا سکتا تھا۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ان کی وفات کے بعد جب رہائش کی منتقلی کا مرحلہ پیش آیا اور بن عمران سے فریج کلیب منتقل ہونا ہوا، تو سامان کی ترتیب و تنظیم کے دوران وہ کارٹن، جن میں یہ قیمتی فائلیں محفوظ تھیں، بدقسمتی سے کہیں گم ہو گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ کو جب اس علمی خزانے کا خیال آیا تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ یوں وہ تحریری اثاثہ، جو دراصل ان کی راتوں کی محنت، دنوں کے مطالعے اور فکری کاوشوں کا نچوڑ تھا، وقت کی گرد میں کہیں گم ہو گیا۔ حقیقت میں وہ فائلیں، ایک زندہ

ذہن کی علمی یادگاریں تھیں، جن کے ضائع ہو جانے کا دکھ ان کے اہلِ خانہ اور قریبی احباب کے دلوں میں آج بھی تازہ ہے۔

## جادۂ اخلاق کا مسافر

ان کا عمل ان کے علم کا آئینہ دار تھا۔ وہ حسنِ اخلاق، شفقت، حلم اور کسرِ نفسی کا ایسا مجسم نمونہ تھے کہ ان سے ملنے والا شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی زندگی صلہ رحمی، والدین کی خدمت اور اہلِ خانہ کے ساتھ محبت و اپنائیت سے عبارت تھی۔ وہ ضرورت مندوں کی مدد میں ہمیشہ پیش پیش رہتے، بسا اوقات دوسروں کے لیے خود تنگی برداشت کر لیتے، مگر کبھی شکایت کا شائبہ تک نہ آنے دیتے۔ ان کا شیوہ اپنے ساتھیوں اور ہم عصروں کے کاموں کو آسان بنانا تھا۔ ان کے نزدیک دین محض وعظ و کتاب کا نہیں بلکہ عمل اور کردار کا نام تھا۔

ان کا حلقۂ تعلق کسی ایک جماعت یا مکتبِ فکر تک محدود نہ تھا۔ جماعتِ اسلامی، اہلِ حدیث اور تبلیغی جماعت کے ذمہ داران سب ہی ان کا یکساں احترام کرتے تھے، اور ان کی وفات پر مختلف حلقوں کا اظہارِ محبت ان کی وسعتِ مزاجی کا روشن ثبوت تھا۔ مخالفانہ حالات اور تلخ تجربات کے باوجود ان کا طرزِ عمل ہمیشہ یکساں رہا۔ فکری اختلافات اور ناگوار رویّوں کے باوجود انہوں نے نہ کبھی شکوہ کیا، نہ غیبت کا راستہ اپنایا، نہ انتقام لیا اور نہ بدسلوکی کا جواب بدسلوکی سے دیا۔ وہ خاموشی، صبر اور حسنِ ظن کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔

ادا جعفری کے الفاظ میں گویا ان کی کیفیت یہ تھی:

جلنا تو خیر چراغوں کا مقدر ہے ازل سے
یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں

ان کی یہی خاموش استقامت وقت کے ساتھ بہت سے اختلافات کی حدّت کو ماند کرتی گئی، مگر ان کا حسنِ اخلاق، وقار اور خیر خواہی لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان سے ملنے والا شخص انہیں صرف ایک عالم یا قاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے مخلص خیر خواہ کے طور پر یاد رکھتا تھا جو تعلق نبھانا جانتا تھا۔ ان کی مجلس میں مختلف حلقوں اور مختلف مزاجوں کے لوگ یکساں اپنائیت محسوس کرتے تھے، کیونکہ ان کے خلوص، وسعتِ ظرف اور محبت آمیز رویّے نے بہت سے فاصلے خود بخود مٹا دیے تھے۔

## مہمان نوازی... ایک مکمل داستان

مہمان نوازی گویا ان کی فطرت اور مزاج کا حصہ تھی۔ قاہرہ کی طالب علمی ہو یا دوحہ کی علمی و دعوتی زندگی، ان کا گھر مسافر، طالب علم، عالمِ دین اور دینی کارکن کے لیے ایک بے تکلف پناہ گاہ اور کھلا مہمان خانہ بنا رہا۔ جامعہ ازہر کے ایام میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور پورے برصغیر سے آنے والے طلبہ ومسافروں کے لیے ان کا دروازہ ہمیشہ وا رہا۔ اجنبی دیار میں آنے والوں نے نہ صرف رہائش اور طعام پایا بلکہ ایسی اپنائیت اور شفقت بھی دیکھی جس نے پردیس کی اجنبیت کو گھر کی مانوس فضا میں بدل دیا۔ یوں قاہرہ میں ان کا گھر ایک ایسے مرکز کی صورت اختیار کر گیا تھا جہاں برصغیر سے آنے والے طلبہ اور مسافر اپنے پن کا احساس پاتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی محض رسمی خدمت نہ تھی بلکہ خلوص، تواضع اور محبت کا عملی اظہار تھی۔ کبھی وہ خود اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کرتے، مہمانوں کو محبت سے بٹھاتے اور بار بار اصرار کے ساتھ خدمت کرتے، جیسے میزبان نہیں بلکہ گھر کے بزرگ ہوں۔ ان کی یہ سادگی اور خلوص ملنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ عام طور پر اہلِ علم کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ لوگ ان کی ضیافت کا اہتمام کرتے ہیں، مگر قاری صاحب کی طبیعت اس کے برعکس تھی۔ وہ دوسروں کی دعوتیں کم ہی قبول کرتے تھے، البتہ اپنے گھر لوگوں کو مدعو کرنے میں غیر معمولی خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دسترخوان بھی دعوتِ دین، اخوت اور دلوں کو جوڑنے کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ اسی لیے ان کا گھر ہمیشہ مہمانوں سے آباد رہتا اور ان کی خوش دلی سے کی گئی میزبانی دیر تک یاد رہتی۔

یہی روایت قطر میں بھی پوری آب و تاب سے جاری رہی۔ ان کی رہائش گاہیں... فریج عبدالعزیز سے فریج بن عمران تک... جامعۃ الفلاح کے اساتذہ، ذمہ داران اور وفود کے لیے مستقل مرکز بن گئیں۔ ہر آنے والا وفد ان کی ذاتی توجہ، پرتپاک استقبال اور قیام وطعام کے انتظامات سے مستفید ہوتا، اور یہ خدمت ان کے لیے محض ذمہ داری نہیں بلکہ قلبی مسرت کا باعث ہوتی۔

وہ صرف میزبان نہیں بلکہ تعلقات کے معمار تھے۔ ان کے دسترخوان سے اٹھنے والا ہر شخص صرف کھانا نہیں بلکہ محبت، اخلاص اور اپنائیت کا احساس ساتھ لے کر جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک سے آنے والے علماء، طلبہ اور دینی کارکن آج بھی ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کی علمی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی بے مثال مہمان نوازی کو ضرور یاد کرتے ہیں۔

## بجھتے چراغ، امنڈتے آنسو

وقت گزرتا گیا، زندگی نشیب و فراز دکھاتی رہی، یہاں تک کہ وہ گھڑی آ پہنچی جس نے ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا۔ بیماری کے ایام آئے، پھر وقتی بہتری بھی ہوئی، اور وہ از سرِ نو علمی و دعوتی سرگرمیوں میں پوری دل جمعی سے مشغول ہو گئے۔ مدینۃ خلیفہ کے مرکز الدعوۃ والارشاد کی مرکزی لائبریری کی تنظیم و بہتری میں ان کی دلچسپی نمایاں رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی ایک بار پھر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں ہے، مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۵ دسمبر ۲۰۰۵ء کو، ۵۴ برس کی عمر میں وہ چراغِ سحر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

تھے کتنے ستارے کہ سرِ شام ہی ڈوبے
ہنگامِ سحر کتنے ہی خورشید ڈھلے ہیں

ان کا اٹھ جانا گویا ایک بستی کا اجڑ جانا تھا۔ وہ کسی ایک جماعت یا مکتبِ فکر کے حلقے میں محدود نہ تھے؛ ان کا اخلاص، ان کی محبت اور ان کا درویشانہ اخلاق سب کے لیے عام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے انتقال کی خبر نے ہر دل کو جھنجھوڑ دیا... جماعتِ اسلامی، اہلِ حدیث اور تبلیغی جماعت سب یکساں طور پر اشکبار تھے، جیسے ہر شخص نے اپنا کوئی اپنا خیر خواہ کھو دیا ہو۔ مگر ان کی محبوبیت کا اصل پیمانہ صرف اہلِ علم کا غم نہیں تھا۔ ان کی وفات پر دکاندار، مزدور، ٹیکسی ڈرائیور اور عام لوگ بھی اسی شدت سے رنجیدہ تھے، جو بھی کبھی ان کے اخلاق، مسکراہٹ یا کسی چھوٹے سے احسان سے متاثر ہوا تھا، وہ اس صدمے میں شریک تھا۔ گویا انہوں نے صرف ذہنوں کو نہیں، دلوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔

قطر کی عرب قیادت میں بھی انہیں غیر معمولی قدر و منزلت حاصل تھی۔ سابق وزیرِ اوقاف شیخ عبداللہ دباغ ان سے گہرا قلبی تعلق رکھتے تھے۔ ظاہری قد و قامت کے فرق کے باوجود دونوں کے درمیان محبت ایسی بے تکلف تھی کہ ملاقات کے وقت شیخ صاحب انہیں شفقت سے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتے تھے، جیسے کوئی بزرگ اپنے عزیز کو سینے سے لگا رہا ہو۔ یہ منظر دیکھنے والوں کے لیے محبت اور خلوص کی زندہ تصویر تھا۔ ان کے انتقال پر قبرستان کی مسجد میں شیخ عبداللہ دباغ کے رقت آمیز کلمات آج بھی لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ ان کی آواز بار بار جذبات سے بھر جاتی تھی اور حاضرین بھی آبدیدہ تھے۔ اس لمحے نے یہ گواہی دی کہ مرحوم کی محبت صرف اردو بولنے والوں تک محدود نہ تھی بلکہ عرب اہلِ علم اور قیادت کے دلوں میں بھی وہ ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

ان کے انتقال کے چند روز بعد حلقۂ رفقائے ہند، قطر کے زیرِ اہتمام شانتی نکیتن انڈین اسکول، دوحہ میں ایک عظیم الشان تعزیتی اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں بڑی تعداد میں علماء، دانشوروں، دینی کارکنوں اور برصغیر کے علاوہ عرب دنیا سے تعلق رکھنے والے ان کے محبین نے شرکت کی۔ مقررین نے ان کی علمی خدمات، دعوتی جدوجہد، حسنِ اخلاق اور ذاتی تعلقات کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کی مغفرت کے لیے اجتماعی دعا کی۔ یہ اجتماع اس بات کا بین ثبوت تھا کہ مرحوم نے مختلف حلقوں اور مختلف قومیتوں کے دلوں میں یکساں محبت پیدا کی تھی۔

اس موقع پر معروف شاعر و ادیب پروفیسر سلیم شاذ نے اپنے تعزیتی قطعے کے ذریعے مرحوم کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا، جو اس اجتماع کی یادگار بن گیا:

شمس و قمر پہ آج جدائی کا بار ہے　　منظر یہ فرطِ غم کا بڑا دل فگار ہے
عالم کی موت، رحلتِ عالم شمار ہے　　شمسی تری حیات سے یہ آشکار ہے

وہ اپنے پیچھے کم عمر بچے چھوڑ گئے جنہیں باپ کی شفقت کی شدت سے ضرورت تھی، اور کئی علمی منصوبے بھی۔ جامعہ ازہر میں پی ایچ ڈی کا نامکمل سفر، اور وہ عربی و اردو تحریری ذخیرہ جو زمانے کی گرد میں گم ہو گیا۔ مگر ان سب بکھری ہوئی چیزوں کے باوجود ایک چیز مکمل رہی: ان کی یاد، ان کی محبت، اور ان کی وہ خوشبو جو آج بھی دلوں میں رچی بسی ہے۔

چراغ بجھ ضرور گیا، مگر اس کی روشنی باقی رہ گئی۔ اور شاید یہی کسی باکمال زندگی کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ وہ اپنے اختتام کے بعد بھی دوسروں کے دلوں میں اجالا چھوڑ جائے۔ قریبی رفقا کی آنکھوں میں یہ ادھوری داستان غالب کے اس شعر کی صورت اترتی ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

## روشنی، جو نسلوں میں منتقل ہو گئی

چراغ بجھ گیا، مگر اس کی روشنی باقی رہی؛ بلکہ وقت کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ یہ روشنی آج بھی ان کے گھر کے ماحول، ان کی اولاد کے کردار اور ان کے مشن کے تسلسل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے وصال کے بعد ان کی باوقار، صابر اور حوصلہ مند رفیقۂ حیات محترمہ قمر جبیں صاحبہ (فاضلہ جامعۃ الصالحات) نے نہایت استقامت کے ساتھ بچوں کی تربیت اور گھر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ وہ صرف ماں نہیں رہیں

بلکہ ایک مربیہ، معلمہ اور باپ کی کمی پوری کرنے والی سرپرست بن گئیں۔ بعض مخلصین نے اکلوتے صاحبزادے عبدالرحمن کو فوری طور پر روزگار سے وابستہ کرنے کا مشورہ دیا، مگر انہوں نے علم کا راستہ اختیار کیا، اور وقت نے ان کے فیصلے کی حکمت کو ثابت کر دیا۔

قمر جبیں صاحبہ نے MES اسکول میں تدریسی خدمات انجام دیں، خواتین کے دعوتی و تربیتی حلقوں میں سرگرم رہیں اور ناظمہ کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ یوں انہوں نے اپنے شریکِ حیات کے مشن کو خاموشی مگر مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھایا۔ ان ہی کی تربیت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ عبدالرحمن شمسی نے MES اسکول، پھر CNA-Q دوحہ اور بعدازاں برطانیہ سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آج وہ الجزیرہ نیوز نیٹ ورک میں سینئر انجینئر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں اور حلقۂ رفقائے ہند کی یوتھ ونگ، انڈین اسلامک یوتھ سرکل (IIYC) کی قیادت بھی کر چکے ہیں۔ ان کی دو صاحبزادیاں، رمیسا اور رفیدہ، دینی اور عصری تعلیم کے حسین امتزاج کی مثال ہیں۔ جامعۃ الصالحات رامپور سے دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ انہوں نے جدید تعلیم میں بھی نمایاں مقام بنایا، طالبات کی تنظیم IIYGC سے وابستہ رہیں، اور آج اپنے گھروں میں دینی اقدار، شائستگی اور وقار کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری محمد عرفان شمسی فلاحی ازہریؒ کا چراغ بجھا نہیں، بلکہ اس کی روشنی نسلوں میں منتقل ہو گئی ہے؛ کبھی علم کی صورت میں، کبھی کردار کی شکل میں، اور کبھی دعاؤں کی صورت میں۔

وہ شخصیت... جو مائیک پر کھڑی ہوتی تو اذان کی روح جاگ اٹھتی تھی،
جس نے فلاح سے ازہر اور قاہرہ سے قطر تک علم کے چراغ روشن کیے،
جس کا دسترخوان، دل اور دروازہ سب کے لیے کھلا تھا،
وہ واقعی ایک چراغِ سحر تھا... جو بجھ کر بھی روشنی دیتا رہا۔

اللہ تعالیٰ قاری صاحبؒ کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

محمد ارشد جمال

# پروفیسر غفران احمد مرحوم
# آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

## یہ کیا ہوائیں گزرتی ہوئی ابھی گئی ہیں:

ماضی قریب میں دنیائے انسانیت نے ایسی ناگفتہ بہ ساعتوں کا مشاہدہ کیا ہے جسے حقیقی معنوں میں ’’سانسیں تنگ ہوجانے‘‘ کی عملی تصویر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کرونا کی عالمی وباء نے جس انداز سے ماحول کو مسموم کردیا تھا گویا اس نے ہواؤں کے بدن پر کانٹے اگادیے ہوں جو ہر ذی روح کی قبا سے ریشم ادھیڑنے کے کام پر مامور ہو۔ گویا ہواؤں نے اپنے ہاتھ میں پتھر اٹھا لئے ہوں اور چن چن کر ہر ذی نفس کو زخمی کردینے کے درپے ہوں۔ کوئی بھی سانس ایسا نہیں تھا جو اس وباء کی ستم سامانیوں سے محفوظ رہ سکا ہو۔ کوئی اس سے تحفظ کے حصول کے لئے اذیت کی خاک پھانکنے پر مجبور تھا، کوئی مرض کی زد میں آکر بے حال تھا، کوئی اس کے عوارضات سے زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا، کسی پر اعزہ و اقرباء کی رحلت کا صدمہ پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا تھا، کسی پر اپنے سرپرست کو کھودینے کا غم مسلط تھا تو کسی کو اپنے سہارے کی لاٹھی کے ٹوٹ جانے کا رنج کھائے جارہا تھا۔ غرض یہ کہ پورا عالم ایک عجیب طرح کی بے سروسامانی اور وحشت سے دوچار تھا، ایک عجیب ہُو کا عالم تھا جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ معیشت سے لیکر معاشرت تک انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جو اس کی زد میں آنے سے محفوظ رہ سکا ہو۔

منظور دل کو شرح غم داستاں نہیں
بتلائیں کیا کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں

## سخن سراؤں سے زہرہ جبیں چلے گئے ہیں:

کرونا کی عالمی وباء نے جہاں زندگی کے ہر دوسرے شعبے کو متاثر کیا وہیں اس نے انسانی جانوں کے ضیاع کی ایک طویل فہرست بھی مرتب کی ہے۔کیا عام،کیا خاص،کیا امیر،کیا غریب،کیا تاجر،کیا مزدور ،کیا شرفاء،کیا اتقیاء،کیا محلات،کیا جھونپڑ پٹیاں،جہاں جہاں اور جس جس تک اس کی رسائی ہوئی اس نے موت کے پنجے گاڑنے میں کسر نہیں چھوڑی۔اس ام الوباء کی تباہ کاریوں کے طفیل بے شمار علمی و ادبی شخصیات نے اس جہان فانی سے اپنے رشتے کو منقطع کرلیا اور اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد کردیا۔متعدد ایسی شخصیتیں جن سے علم وفن اور تہذیب وثقافت کی بازیافتیں منسوب تھیں نے داعی اجل کو لبیک کہنے میں عافیت سمجھی۔کئی ایسے چاند جو سرآسماں اپنی روشنی بکھیرنے میں منہمک تھے نہ صرف یہ کہ ماند پڑ گئے بلکہ شاخ فلک سے تعلق کو بحال رکھ پانے میں بھی ناکام رہے۔ادباء وشعراء، اطباء ومحققین،علماء وسائنس داں غرض یہ کہ علوم وفنون سے جڑے افراد کی ایک بڑی کھیپ آن کی آن میں ہم سے بچھڑ کر خون نے آنسو رونے پر مجبور کرگئی اور ہم ”میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو“ کی تفسیر بن کر رہ گئے ہیں۔

کیا جانے وہ ستارہ جبیں کون لوگ تھے
محراب شب میں نور بچھا کر چلے گئے

## جو محبتوں کی اساس تھے وہی لوگ ہم سے بچھڑ گئے:

کووڈ کی وبا میں ہم نے بہتوں کو کھویا،بہتوں نے ہماری جبینوں پر مفارقت کے داغ ثبت کئے۔ ہمارے والدین نے ہم سے ہاتھ چھڑا لیا جن کی انگلی تھام کر قدم آگے بڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا،ہم سے ہمارے ان رشتہ داروں نے ناطہ توڑ لیا جو ہمارے خونی شریک تھے،ہمارے وہ رفقائے کار ہم سے دامن چھڑا گئے کہ پیشہ ورانہ زندگی میں جن کی پل پل معیت ہمیں نصیب تھی،ہمارے وہ دوست واحباب زندگی سے روٹھ گئے جن کے دم سے ہمیں خوش حالی وشادابی کے لمحات میسر تھے، ہمارے ان اساتذہ نے اپنے سینے میں موجود سانسوں کی لڑی کو توڑ کر پھینک دیا جنھوں نے ہمیں رہ زیست کے انمول قرینوں سے متصف کیا۔

کس کس کو یاد کیجئے کس کس کو روئیے

بچھڑنے اور زندگی سے روٹھ جانے والے احباب کی اس گونا گونی میں چند ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ہجر کا غم ہنوز سینے کا الاؤ بنا ہوا ہے اور ساعت بہ ساعت شرر بار ہو کر روح کو زخمی کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب بھی ان کی یادوں کے بجھے ہوئے چراغ سے مٹی اڑائی جاتی ہے ذہن وخیال کی دیواروں سے روشنی کی تہیں لپٹ جاتی ہیں۔ ستارے، چراغ، انجم ومہتاب حقیقی معنوں میں ان کی ذات کے استعارے ہیں۔ رنگ ونور، خوشبو، پاکیزگی اور حلاوت جیسی صفات جن کی عادات واطوار کے جھرنوں سے تراوش پانے والے مظاہر ہوتے ہیں جنھیں محسوسات کی بساط پر دور تک اور دیر تک بنے رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی ہی شخصیات میں طب یونانی کی ایک قدآور شخصیت پروفیسر غفران احمد مرحوم کی ذات بھی تھی جن کی رحلت کے سبب ہماری روحیں کلیجہ تھامیں کھڑی ہیں اور ہم کانٹوں سے اپنے زخموں کی رفوگری میں لگے ہوئے ہیں۔

آسماں کے رخ پہ اپنی ضوفشانی چھوڑ کر
چاند رخصت ہو گیا یادیں سہانی چھوڑ کر

## وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی:

پروفیسر غفران احمد مرحوم عصری طبی تاریخ کا ایک روشن اور تابندہ باب تھے۔ ان کی ہستی شہرت اور مقبولیت کے مدارج سے کہیں آگے محبوبیت کے مقام پر فائز تھی۔ وہ اذہان کے دریچوں میں قندیل بن کر جگمگاتے رہنے کی تاثیر سے مملو تھے۔ ان کی ذات دراصل اجالوں کی ایک ایسی رمق تھی جو کسی بھی تاریک خلا کو پر کرنے کی مجاز تھی۔ ان کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جسے بآسانی خانہ یادداشت سے محو نہیں کیا جاسکتا۔ فی الوقت خلیل جبران کی تحریر کا ایک اقتباس میری نگاہوں کے روبرو رقصاں ہے:

مَا زِلْتُ أُؤمِنُ...
أَنَّ الإِنْسانَ لا يَمُوتُ دُفْعَةً واحِدَةً،
وَإِنَّما يَمُوتُ بِطَرِيقَةِ الأَجْزاء،
كُلَّما رَحَلَ صَدِيقٌ ماتَ جُزْءٌ،
وكُلَّما غادَرَنا حبيبٌ ماتَ جُزْءٌ،
وكُلَّما قُتِلَ حُلْمٌ مِنْ أَحلامِنا ماتَ جُزْءٌ،
فَيَأْتِي المَوْتُ الأَكْبَرُ لِيَجِدَ كُلَّ الأَجْزاءِ مَيِّتة
فَيَحْمِلُها وَيَرْحَلُ..

ترجمہ:

’’میں اب بھی مانتا ہوں
کہ انسان ایک دم نہیں مرتا
بلکہ وہ ٹکڑوں میں مرتا ہے
جب بھی کوئی دوست رخصت ہوتا ہے، ایک حصہ مرجاتا ہے
اور جب بھی کوئی محبوب ہم سے جدا ہوتا ہے، ایک حصہ ختم ہوجاتا ہے
اور جب بھی ہمارے خوابوں میں سے کوئی ایک خواب مرجاتا ہے، ایک حصہ تحلیل ہوجاتا ہے
اور یوں، آخر میں، حتمی موت آتی ہے، جو تمام اجزاء کو مردہ کردیتی ہے۔
پس وہ اُنہیں اُٹھاتی ہے اور چلی جاتی ہے‘‘۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی رحلت کا صدمہ بھی فی الواقع ایک ایسا ہی صدمہ ہے جو پل پل ہمیں مارتا رہے گا۔ وہ ہمارے لئے محض علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ علم الادویہ کے ایک لائق وفائق استاذ ہی نہیں تھے بلکہ وہ طبی دنیا کا ایسا خواب تھے جسے ہر آنکھ نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اسے بہ حسرت تمام سجا کر رکھا تھا۔ طب یونانی سے جڑی ہوئی کتنی ہی خوش نما تعبیریں تھیں جنھیں ان کی ذات سے جوڑ کر دیکھا جارہا تھا، کتنے ہی ایسے ناتمام خاکے تھے جن میں ان کی ذات کے توسط سے رنگ بھرا جانا تھا، کتنے ہی ایسے مٹی کے خام نمونے تھے جنھیں سرِ چاک ان کے لمس کوزہ گری سے مشکّل ہونا تھا۔ لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا وہ عمر عزیز کی ڈھلوان پر ہی اپنے سیکڑوں چاہنے والوں کو غم زدہ چھوڑ کر کرونا کے ہاتھوں پیوند خاک ہوگئے اور شام ہونے سے قبل ہی موت کی سیاہ چادر میں روپوش ہوگئے۔ راحت اندوری نے غالباً ایسے ہی موقع کے لئے یہ شعر کہہ رکھا تھا:

مذاق اچھا رہے گا یہ چاند تاروں سے
میں آج شام سے پہلے ہی ڈھل کے دیکھوں گا

## وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں:

اعظم گڑھ کی شاداب اور زرخیز مٹی کے خمیر سے نمو پانے والے پروفیسر غفران احمد کی شخصیت میں ایک طرف جہاں وہاں کے معتبر ترین دینی تعلیمی ادارے جامعۃ الفلاح کی تربیت کا پرتو موجزن تھا وہیں ان

کی ذات میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تہذیب کی ساری اشارتیں بھی نمو پذیر تھیں۔ وہ علم وعمل کے توازن کی اعلیٰ مثال تھے۔ وہ اپنی ہستی میں کسی سمندر سے کم نہ تھے لیکن تبحرِ علمی سے آراستہ ہونے کے باوجود تند خوئی کو اپنے آس پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ نرم روی ان کے مزاج کا خاصہ تھی، اکثر اوقات خاموشی کو گفتگو کا وسیلہ اظہار بناتے، بولتے تو کم گوئی سے دامن استوار رکھتے۔ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے تو علمیت کے اثر سے ان کی پیشانی چمکتی رہتی۔ ایسے ایسے نکات کو موضوع کا حوالہ بناتے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے اور ان کی وسعت نظری کی داد دئے بغیر خاموش نہ رہتے۔ فلسفیانہ اور منطقی موضوعات پر بھی ایسے خوبصورت پیرائے میں وضاحت کناں ہوتے کہ وہ آیتوں کی طرح ذہن ودل میں اترتے محسوس ہوتے۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے:

فکر میری گہر اندوز، اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموز، عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

پروفیسر غفران احمد مرحوم کے پاس چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا بہت ہی واضح تصور موجود تھا۔ فکری ونظریاتی سطح پر ان کے یہاں ایسا شاندار استحکام پایا جاتا تھا جو فی زمانہ لوگوں میں نادر و نایاب ہے۔ وہ وجودی مسائل اور مذہبی وروحانی معاملات ہر ایک حوالے سے اپنی رائے رکھتے تھے۔ خواہ وہ قدیم طبی عناوین ہوں، یا جدید عصری موضوعات، ان کا تعلق طبی مبادیات سے ہو یا اطلاقیات سے ہر پہلو ان کے یہاں انتہائی شفاف اور الجھاؤ سے پاک عناصر سے تشکیل پاتا تھا۔ انھوں نے طب کا علم ہی نہیں حاصل کیا تھا بلکہ اس کے سفرِ ارتقاء کے ہر سنگ میل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ بظاہر خاموش رہنے والی ان کی ہستی میدان عمل میں ویسی ہی فعال اور سرگرم رہتی تھی۔ وہ کوتاہیوں اور کمیوں سے گھبرا کر توسنِ عمل کی باگ موڑنے کے قائل نہ تھے بلکہ استقلال اور سخت کوشی کے ساتھ منصب پر ڈٹے رہنے کے حامی تھے۔ تدریس سے لیکر تحقیق تک، تالیف سے لے کر ترتیب تک اور ادارت سے لے کر تنظیم تک ہر عمل ان کے یہاں اپنی خوبصورت ترین شکل میں انجام کو پہونچتا تھا۔ ان کے وجود کے کشکول میں متواتر، شائستہ، کھرے، سچے، صالح اور نیک اطوار سکے کھنکتے رہتے جو لوگوں کی توجہ کا مرکز ٹھہرتے۔ ان کے گلستانِ طینت میں پاکیزگی کے ایسے خوش رنگ پھول کھلتے تھے جس کی کشش بے

اختیار خوشبو پسند لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ بقول علامہ اقبالؔ:

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

## وہ ترا پھول سا لہجہ وشگفتہ اسلوب:

پروفیسر غفران احمد مرحوم اپنی ذات میں تاروں بھری انجمن تھے۔ وہ طلباء کے لئے سراپا آئینۂ شفقت، اساتذہ کے محبوب نظر، علمی وادبی حلقوں میں ممتاز، دوستوں کے درمیان بے تکلف، داد وستائش سے بے نیاز، تملق و چاپلوسی سے متنفر، فیاضی وفراخ دلی سے آباد، بے جا تکلفات سے گریزاں، تصنع و بناوٹ سے دور، کبرور یا وخودنمائی سے پاک، فیاضانہ شان سے زندگی بسر کرنے والے پر کشش اور دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ محفلوں میں عموماً احباب کی گفتگو میں مخل ہونے سے اجتناب کرتے لیکن جہاں ضروری سمجھتے یا جب ان سے بولنے کے لئے کہا جاتا تو پھر" ساری محفل بھول گئی تیرا لہجہ یاد رہا" کے مصداق ہو جاتے۔ وہ یوں تو میدان قلم کے شہسوار تھے لیکن جب کبھی بھی تقریر کی لذتیں ان کے نطق کا بوسہ لینے پر آمادہ ہوتیں اور وہ اپنی رَو میں ہوتے تو سماعتیں شیرینی کشید کرتی رہ جاتیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں گفتگو کرنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے تاہم مادری زبان سے بے پناہ محبت کے سبب وہ مقامات جہاں انگریزی میں گفتگو ناگزیر نہ ہوتی اردو کو ہی ترجیح دیتے اور گل افشانی گفتار کی ایسی مثال پیش کرتے کہ زبان و بیان کے دامن شگفتگی سے بھر جاتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین کی کسی تقریب میں سخن سرا ہوئے تو طلباء وطالبات کے ناموں کو الفاظ کی لڑی میں اس انداز میں پروکر پیش کیا لوگ حیران تھے کہ جملوں کی معنویت اور اس کے طلسم پر سر دھنیں یا ناموں کے استعمال کی خوش اسلوبی پر عش عش کریں۔ مرزا غالبؔ ایک بار پھر یاد آرہے ہیں:

ترا انداز سخن شانہ زلف الہام
تری رفتار قلم جنبش بال جبریل

## ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے:

استاد محترم پروفیسر غفران احمد مرحوم کی شخصیت ایک انتہائی خلیق اور مہربان مٹی سے وجود پاتی تھی۔ ان کی ذات بے لوثی، اخلاص اور اپنائیت کا مرقع تھی۔ ہر کسی کی فریادرسی کے لئے ہمہ تن گوش، ہر کسی کے رنج و

غم میں شریک، ہر کسی کے تعاون کے لئے آمادہ۔ کوئی بھی ان کے در پر کاسۂ ضرورت لے کر آتا تو خالی ہاتھ نہ جاتا۔ حاجت روائی جیسے ان کے آستانے کی شان تھی۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ سامنے والے کی پیاس کو از خود محسوس کر لیتے اور بڑھ کر اس کا گلاس بھر دیتے۔ ہر وقت لوگوں کی علمی و قلمی امداد کے لئے بر سر پیکار رہتے۔ کبھی کسی کی synopsis کو انجام تک پہونچا رہے ہیں، کبھی کسی کے ریسرچ پروٹوکول کو آخری شکل دے رہے ہیں، کبھی کسی کی تھیسیس کو اصلاح و ترمیم کے مراحل سے گزار رہے ہیں، کبھی کسی کے مضمون میں امکانات کے در تلاش کر رہے ہیں تو کبھی کسی کی کتاب پر تقریظ لکھ کر اس کی اہمیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تعاون اور معاونت کا یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ انفرادی سطح پر قائم رہتا بلکہ شعبہ جاتی اور ادارہ جاتی سطح پر بھی وہ اپنی وسعت نظری، مقصد برآوری اور جاں فشانی کے سبب لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ٹھہرتے۔ اکثر اوقات یہ نوبت بھی آجاتی کہ سارا کام خود ان کے سر پر آن پڑتا جسے وہ تمام تر خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہونچاتے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی شخصیت کا ایک اہم اعجاز یہ بھی تھا کہ وہ ہر ملاقاتی کے دل میں گھر کر جانے کی بے پناہ صلاحیت سے مالا مال تھے۔ ایک عجیب طرز کی شان محبوبیت اور جاذبیت ان کی ذات کا حصہ تھی۔ جو بھی ان سے ملتا نہ صرف ان کا گرویدہ ہو جاتا بلکہ انھیں اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا۔ جس سے بھی ان کے حوالے سے معلوم کریئے اس کا دامن ان کے کسی نہ کسی احسان سے گراں بار ضرور ملتا، جس کسی سے بھی ان کا تذکرہ کیجئے وہ ان کے لئے رطب اللسان ہوتا اور ان پر ریشہ خطمی پایا جاتا۔ طلباء و اساتذہ کی ان کے لئے مدح سرائی تو سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ان کا آپس میں ایک مستقل تعلق اور انسلاک بنا رہتا ہے لیکن دیگر ماتحتوں کی ایک بڑی تعداد جو ان سے محض چند دنوں کی رفاقت کے امین ہیں وہ بھی ان پر ویسے ہی فریفتہ نظر آتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان کا ذکر خیر آتے ہی لوگوں کی آنکھوں میں ان کے لئے عزت و احترام کی لو روشن ہو جاتی ہے۔ عمیر نجمی نے سچ ہی کہا ہے:

یہ نہیں ہے کہ فقط میں ہی اسے چاہتا ہوں
جو بھی اس پیڑ کی چھاؤں میں گیا، بیٹھ گیا

## سامنے کوئی بحسنِ انتظام آ ہی گیا:

پروفیسر غفران احمد مرحوم کی فعالیت کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع تھا۔ ایک اور پہلو جو ان کی شخصیت کو

انفرادبخشا تھا وہ ان کی انتظامی صلاحیت تھی۔کم ہی اسکالرس ایسے ہوتے ہیں جو علم اوراس کے متعلقات پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ انتظامی اموراوراس کی پیچیدگیوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ چنانچہ استاذ محترم کوخوش انتظامی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔وہ ذمہ داریوں کی مشکل بھری رہ گزر پر بھی بہ سہولت گزر جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔اپنی اسی صلاحیت کے سبب انھوں نے تدریس وتحقیق سے وابستہ رہتے ہوئے بھی نہ صرف ملکی وبین الاقوامی علمی اجتماعات اورسیمینارس کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اجمل خان طبیہ کالج اورنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین ، بنگلور میں شعبہ علم الادویہ کی صدارت کرتے ہوئے طلباء واساتذہ اور متعلقین کے دلوں پرراج بھی کیا۔علاوہ ازیں این آئی یوایم میں ڈپٹی ڈائرکٹرشپ کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے آپ نے انتظام کار کی ایک نہ مٹنے والی نظیر بھی چھوڑی ہے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ ان کی موجودگی کے باعث اس وقت کے ڈائرکٹر پروفیسر مستحسن علی جعفری صاحب کے شانے جوذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے رہتے تھے ایسے سبک ہو گئے تھے کہ گویاان پر کبھی سرگرانی طاری ہی نہ ہوئی ہو۔

عام طور پر کسی منصب پر فائز ہونے کے بعد صاحب مسند کے لئے ہر کسی کو خوش رکھ پاناممکن نہیں ہوتا ہے۔بعض ضرورتوں کی تکمیل چند نا گفتہ بہ اور نامساعد حالات کے پیش نظر زیرالتوا بنی رہتی ہے۔کبھی کچھ ایسے تکنیکی مسائل بھی ہوتے ہیں جن کا ادراک صرف ذمہ داران کو ہوتا ہے، ماتحت افراد ان تک رسائی سے قاصر رہتے ہیں ،ایسی صورت میں عہدہ داروں سے بدگمان اور نالاں ہونے کے وافرمواقع ہوتے ہیں۔عام روایت بھی یہی ہے کہ موجودہ افسر کوسابقہ کے مقابلے ہمیشہ ناموزوں قرار دیا جاتا ہےاورادارے سے جڑے ہوئے زیادہ تر لوگوں کی زبان پران کے لئے حرف شکایت ہی پایا جاتا ہے۔اس حقیقت سے قطع نظر پروفیسرغفران احمد مرحوم کی شخصیت میں نہ جانے ایسا کون ساسحر تھا کہ خواہ وہ صاحب منصب ہوں یا نہ ہوں، کسی عہدے پر متمکن ہوں یا نہ ہوں، کسی ذمہ داری کا بوجھ ان کے سر پر موجود ہو یا نہ ہوان کی ذاتِ خوش اطوار سے کسی کونالاں نہیں دیکھا گیا۔کسی کو بھی ان کے خلاف شکایت کناں نہیں پایا گیا۔انھیں تو بس ایک درویش کی طرح اس شعر کا آئینہ بنے رہنے سے مطلب تھا:

کبھی خواص میں شامل کبھی عوام میں ہم
لگے ہوئے ہیں زمانے کے انتظام میں ہم

## جس کی تحقیق نے قطروں سے نکالے دریا:

پروفیسر غفران احمد مرحوم کے علمی مقام و مرتبے کی رفعت کا سب سے معتبر حوالہ ریسرچ و تحقیق کے تئیں ان کا جنون تھا۔طبی ریسرچ کے حوالے سے ان کی یہ بے پناہ دلچسپی اور حد درجہ شوق بظاہر ان کے اساتذہ بالخصوص پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان، پروفیسر کنور محمد یوسف امین صاحب، پروفیسر آفاق احمد صاحب اور پروفیسر نعیم احمد خان کی فیض رسانیوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ان میں موجود اتھاہ صلاحیتوں کے دریا کو دریافت کر کے اسے درست اور مناسب سمت عطا کی۔تاہم ان کی ذاتی للک نے بھی انھیں اس میدان خاص کا سرخیل بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔شعبہ علم الادویہ، اجمل خان طبیہ کالج کا امتیاز جہاں اس کی قدامت ہے وہیں تکنیکی وسائل کی فراہمی اور جدید علوم سے آراستہ اساتذہ کی موجودگی نے بھی اسے اعلیٰ قدروں کا امین بنایا ہے چنانچہ پروفیسر غفران احمد مرحوم نے مہیا ان دونوں دہلیز کی جبیں سائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ان سے خوب خوب کسب فیض کیا۔تحقیق کے میدان میں ان کی آگہی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی جدید سائنٹفک طبی مجلّات و رسائل ان کے مطالعہ کا حصہ ہوتے تھے۔ایسے متعدد جرنلس جن سے عام وابستگان طب کی بصارتیں آشنا بھی نہیں ہوتی تھیں، ان کے مطالعے کی میز کی زینت ہوتے۔غالباً یہی وجہ تھی پوسٹ گریجویشن کی سطح پر شعبہ علم الادویہ کے ساتھ ساتھ دیگر شعبہ جات کے طلباء بھی اکثر اوقات اَن سلجھی گتھیوں کے ہمراہ ان کی قدم بوسی کے لئے حاضر رہتے اور ان کے حل کے ساتھ خوشی خوشی واپس جاتے۔انھوں نے ایم ڈی میں صرف شعبہ علم الادویہ کے طلباء کی ہی سرپرستی نہیں کی ہے بلکہ وہ دیگر شعبہ جات میں بھی طلباء کے نائب نگراں رہے ہیں۔

استاذ محترم کی تحقیقی دلچسپیاں یوں تو کسی ایک محور پر مرتکز نہیں تھیں، وہ جسمانی نظام کی ہر کڑی سے یکساں واقفیت رکھتے تھے لیکن امراض نظام بول اور امراض مفاصل سے انھیں خاص علاقہ تھا۔انھوں نے اپنے زیر نگرانی مکمل ہونے والے کل ۳۴ مطالعہ جات میں بول و مفاصل کے مخصوص نظام سے تعلق رکھنے والی دواؤں کی تاثیرات کو پرکھنے میں خاص رغبت دکھائی ہے۔ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ امراض گردہ پر کام کرنے کے لئے آمادہ طلباء کو انھوں نے اپنی سرپرستی عطا کرنے میں فوقیت دی ہے۔

## لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لئے:

پروفیسر غفران احمد مرحوم کا جنون صرف تحقیق کی تکمیل تک محدود نہیں تھا بلکہ معیاری ملکی و بین الاقوامی

سائنٹیفک جریدوں میں تحقیقات کی اشاعت کا اہتمام بھی ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھا۔ وہ سائنٹفک رائٹنگ کی جملہ باریکیوں سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ اس کے بہترین پارکھ بھی تھے۔ اس کا اندازہ ہمیں دوران تعلیم نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین، بنگلور میں جنرل کلبس میں ان کی آراء سماعت کرنے کے بعد ہوا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ وہ نکات جن کو ہم کسی خاطر میں لانے سے گریزاں رہتے وہ ان کی داخلیت کے ایسے اعلیٰ جواز پیش کرتے کہ سب حیران رہ جاتے علاوہ ازیں بعض وہ چیزیں جو ہماری نظروں میں بہت معنی خیز ہوتیں ان کی توضیح کے بعد بے وقعت ہو کر رہ جاتیں۔ متعدد عالمی طبی جرائد کے ادارتی بورڈ، مشاورتی کونسل اور ناقدین کے پینل میں ان کی شمولیت ان کی سائنٹیفک تحریری لیاقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی طب سے جڑے بے شمار اسکالرس اپنے تحقیقی مضامین کی اشاعت کے لئے ان کی ایک آخری نظر کو لازمی سمجھتے تھے۔

حقیقی معنوں میں استاذ محترم کی علمی لیاقت سے طبی دنیا کی واقفیت کی سب سے بڑی وجہ ان کے تحقیقی مقالات کی اشاعت ہی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ یونانی دنیا تحریر و تخلیق کے نام پر ایک یا دو کتابوں کی اشاعت سے آگے کی سوچتی بھی نہیں تھی۔ تحقیقات کی اشاعت سے تو گویا اسے کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔ ایسے میں اگر کسی کا پہلا تحقیقی مقالہ ہی Elsevier جیسے معتبر ترین پبلشرز کے تحت شائع ہونے والے عالمی جریدے میں مقام پا جائے تو لوگوں کا اس کی طرف بنظر استعجاب دیکھنا واجب ٹھہرتا ہے۔ یقینی طور پر استاذ محترم نے اپنے لئے طبی اشاعت کا ایک ایسا معیار متعین کر رکھا تھا جہاں تک لوگوں کا پہونچنا تو کجا سوچنا بھی ناممکنات میں شامل تھا۔ بحیثیت تحقیق کار و معاون محقق ان سے منسوب مجموعی مقالات کی تعداد سو سے بھی زائد پہونچتی ہے۔ سوچنے والے اس بات پر بھی مستعجب ہیں ایک ایسا فرد جس کی ابتدائی و ثانوی تعلیم عربی و اردو میڈیم میں کسی مدرسے سے انجام پائی ہو وہ انگریزی زبان پر ایسی بے مثال قدرت کیسے رکھ سکتا ہے کہ اس سے زائد از صد سائنٹیفک مقالات منسوب ہو سکیں۔ پوری طبی دنیا اس بات کی شاہد ہے کہ پروفیسر غفران احمد مرحوم جس انداز سے ٹکسالی اردو بولنے اور لکھنے پر قادر تھے اسی انداز سے انھیں شستہ و شاداب انگریزی بولنے و لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ بہر حال سچائی تو یہی ہے کہ ان کا قلم حقیقت کی روشنائی سے آشنا تھا اور وہ لوح قلم کے توسط سے زندگی کے عکس کو کاغذ پر اتارنے میں صرف ہو گئے:

ورق ورق تجھے تحریر کرتا رہتا ہوں
میں زندگی تری تشہیر کرتا رہتا ہوں

## مجھے قریب سے پڑھ سرسری نہ دیکھ مجھے:

پروفیسر غفران احمد مرحوم چونکہ پیشہ ورانہ طور پر سائنٹفک تحقیق سے وابستہ تھے اس لئے ان کی زیادہ تر تحریریں بہ زبان انگریزی پائی جاتی ہیں تاہم ان کی فکری جولانیوں نے اردو کے احسان بھی اٹھائے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوائل عمری میں اردو فکشن اور شعری ادب سے ان کا گہرا تعلق رہا ہو۔ ناول، خاکے اور انشائیوں نے فرصت کے لمحات میں ان کے لئے بھی دل بستگی کا سامان کیا ہو۔ دوران تعلیم انھوں نے افسانے بھی تحریر کئے ہیں جو اقامتی ہالوں کی سالانہ میگزین میں شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان سے چند دیگر تحریریں بھی منسوب ہیں جو زبان و بیان اور فکر و تخیل کے اعتبار اپنی شناخت آپ ہیں۔ اردو زبان میں شائع شدہ ان کی تحریریں تعداد میں جتنی کم ہیں ویسی ہی متنوع بھی ہیں۔ چنانچہ یہ شخصی، تاریخی، ادویہ وصیدلہ جاتی، معالجاتی، تقریظی اور مقدماتی ادب کا نمونہ ہیں اور ہر پہلو سے متعلقہ ادب میں بطور مثال پیش کئے جانے کی مجاز ہیں۔

علم الادویہ کے میدان میں پروفیسر غفران احمد مرحوم کی اردو تحریر ایک انتہائی اہم موضوع پر تالیف کردہ ان کی کتاب "اوصاف ادویہ: ضمانت سے محاسبہ تک" ہے جو انھوں نے ڈاکٹر سعود الظفر صاحب کی معیت میں تالیف کی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے تو اہم ہے ہی کہ اپنے موضوع پر ایک انتہائی منضبط اور مبسوط کتاب ہے لیکن اس کی اہمیت بایں لحاظ مزید فزوں تر ہو جاتی ہے کہ اس میں طب کی قدیم معلومات سے لے کر جدید علمی ذخائر اور عصری قانونی اداروں کے احکام و قوانین کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر غفران احمد مرحوم کا سب سے اہم علمی کارنامہ دراصل علم الصیدلہ پر مشتمل ان کی کتاب ''اصول دواسازی'' ہے جس کی تحقیق و تالیف میں انھوں اپنی پوری زندگی کا سرمایہ لٹا دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت دراصل ان کا دیرینہ خواب تھا جسے اٹھتے بیٹھتے ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ شومئ قسمت کہ انھوں نے اپنے خواب کی تکمیل سے قبل ہی داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

اسی لئے تو ہوا رو پڑی درختوں میں
ابھی میں کھِل نہ سکا تھا کہ رت بدلنے لگے

ابتدا میں اس کتاب کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی کے توسط سے کسی پروجیکٹ کے تحت ہونی تھی لیکن صفحات کی زیادتی اور چند دیگر مسائل کی وجہ سے یہ کام تعطل کا

شکار ہو گیا۔ بعد میں استاذ محترم نے اسے ذاتی اخراجات پر شائع کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ بھی بعض اسباب کی بنا پر زیر التوا ہی رہا۔ خدا کا شکر کہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسین سے یہ کتاب ۲۰۲۳ء عیسوی میں زیورِطبع سے آراستہ ہو کر طب یونانی کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کا دم بھر رہی۔ کل ۶۰۰ صفحات پر مشتمل مرحوم کی یہ معرکۃ الآرا تالیف دواسازی پر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔

## آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا:

یہ بات مصدقہ ہے کہ صالح اقدار و نظریات انسان کو وحدت کی لڑی میں پرو دیتے ہیں اور اگر اس نظریے کی اساس عشق ہو تو وحدت الوجود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ استاد محترم کی صالحیت کی مٹی میں گندھی ہوئی ذات بھی کسی ایسی ہی عشق کی آگ میں تپ کر کندن ہوئی تھی جس نے انھیں مودت و محبت کا پیکر بنا دیا تھا۔ ان کا دماغ اگر فلسفی کا تھا تو دل کسی صوفی سے کم نہیں تھا۔ اس اشتراک نے ان کی شخصیت کو وہ نور عطا کیا تھا جس کی شبنمی ضیاء سے ہر کوئی قطرہ قطرہ شرابور تھا اور جس کی کشش سے بانوئے کشور دلبری ان کی دہلیز کی داسی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا تانبے کا جسم جو سونے کی روح سے آراستہ تھا، جس کی آنکھوں میں پل پل ریشمی خواب چمکتے تھے مٹی کی محبت میں سنہری لمحات کی ڈور کو تھامے ہوئے دور کہیں بہت دور کسی اتھاہ خلا میں جا سمایا ہے۔

کاش! روپہلی صبح کے بنفشی پھولوں پر شام کے کاسنی سائے دراز نہ ہوئے ہوتے۔

کاش! حجرۂ درویش کے چراغ کی لو کے کان میں ہوا نے تماشا ختم ہونے کا اعلان نہ کیا ہوتا۔

کاش! کچھ دن اور مٹی کے پیالے تشنگی کے جوالا کو برفاب کرتے۔

کاش! کچھ دن اور سوکھی ٹہنیاں لمس دلآویز کے اثر سے شادابی کا آ بگینہ ٹھہرتیں۔

کاش! کچھ دن اور رگِ جاں سے ٹپکنے والی امید کا جوہر اپنے کرشمے دکھاتا رہتا۔

کاش! کچھ دن اور زندگی کا حقہ اپنے پرانے انداز میں دھوئیں کے مرغولے اڑاتا ہوا، لہراتا، بل کھاتا، کافوری سگندھ چھوڑتا ہوا رفاقت کی دالانوں کو معطر رکھتا!!!

کاش! کچھ دن اور اجل کے دیوتا اپنی چلمنوں سے باہر نہ نکلتے۔

پھر کوئی عکس شعاؤں سے نہ بننے پایا
کیسا مہتاب مرے آئینہ خانے سے اٹھا

پروفیسر غفران احمد مرحوم کے سانحہ ارتحال سے یقینی طور پر یونانی طبی دنیا ایک بہت بڑے خسارے سے دوچار ہوئی ہے۔ ایک ایسا خسارہ جس کی تلافی حال فی الحال ممکن نہیں نظر آتی ہے۔ ان سے بچھڑنے کے غم میں نہ جانے کتنے ہی دلوں کے پرچم جھکے ہوئے ہیں۔ ان کی موت کا زخم ایسا ہی ہے جس کو بھرنے میں مدتیں صرف ہوجاتی ہیں۔ بظاہر خاک کی امانت خاکدان کے حوالے ہوچکی ہے لیکن اس کے ذروں میں موجود درخشانیوں کو ابھی ہمارے حافظے میں محفوظ رہنا ہے۔ اس نے خون کی روشنائی سے سینہ قرطاس پر جو داستانِ وفا رقم کی اسے اتنی آسانی سے زوال آمادہ نہیں ہونا ہے۔ یقیناً فروغ شمع کو صبح محشر تک باقی رہنا ہے۔

☆☆☆

انصار احمد فلاحی۔بلریا گنج

# دھڑکنیں

ہم سب اپنے باپ سے محروم ہو گئے۔

اس صدی کی متعدد شخصیتیں ایسی ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو متاثر کیا ہے۔لیکن اقبالؒ اور مرشد مودودیؒ کی گہری فکری چھاپ کے مقابلے میں دوسروں کی چھاپ پھیکی نظر آتی ہے۔انھوں نے دلوں کو جو ولولۂ تازہ، دماغوں میں انقلابی برقی رو اور ذہنوں کو جو حوصلۂ بے تاب عطا کیا ہے یہ اسی کا فیض ہے کہ آج اسلام محض دھرم کی بجائے مکمل نظام کے روپ میں سامنے آ گیا ہے۔ایک انقلابی تحریک کی شکل میں دنیا کے ہر گوشے میں مصروفِ عمل ہے جس نے ایران کے دو ہزار سالہ مستبد جابر حکومت کا تختہ پلٹ کر امن و انصاف کی حکومت قائم کی،جس نے افغانی مجاہدین کو سرخ بھیڑیوں کو چت کر دینے کا عزم دیا اور جس نے پاکستان میں لادینی عناصر کی لٹیا ڈبو دی ہے۔ہندوستان میں جس کے شیدائی ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے منصورہ میں اکٹھا ہو رہے ہیں۔

مولانا مودودیؒ پہلے فرد ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو انقلابی تحریک کی راہ پر لگایا۔انہیں مقصد سے سچا عشق اور اپنی خودی کا عرفان اور صحیح منزل کی آگہی دی۔انہیں جہانِ فانی کی حقیقتوں سے خبردار کر کے "جہانِ نو" تعمیر کرنے کیلئے تیار کیا، یہی وجہ ہے کہ آج ہم نوجوان مولانا کے انتقال سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔آج ہم ہند و پاک ہوں، یا عرب و عجم،صحرائے افریقہ ہو یا سبزہ زارانِ یورپ، جہاں بھی متحرک ہیں اور اسلامی نظام کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں،سب مرشدی مودودیؒ کا فیضانِ نظر ہے۔

مرشدی مودودیؒ کیا تھے؟ بس یوں سمجھو انقلاب کی آواز تھے،انقلاب جو کاخِ امراء کے در و دیوار کو ہلا کر مزدوروں کی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا اور جسے مغربی استعماریت کا باغ و بہار بننا منظور نہ تھا۔سرخ و سپید سے آزاد انقلاب، دائیں بائیں بازو سے ناوابستہ انقلاب۔امیروں غریبوں کو ایک

صف میں کھڑا کرنے والا انقلاب۔ انسانیت کو ایک خدا کی بندگی پر آمادہ کر کے دوسری تمام بندگیوں سے نجات دلانے والا انقلاب۔ اور یہ آواز اب اقصائے عالم میں گونج چکی ہے۔ جنگل کے پتے پتے پر، درو دیوار کی ہر ہر اینٹ پر، اور انسانوں کے دلوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر انمٹ نقوش ثبت کر چکی ہے۔ اب یہ آواز دبائے نہیں دب سکتی۔ وقت کے جابر حکمرانوں نے اس آواز کو دبانا چاہا، وہ خود دب گئے لیکن یہ ابھرتی چلی گئی۔ اور آج اس کی بازگشت واشگاف سنائی دے رہی ہے۔

سیدی مودودیؒ علم و عمل میں پہاڑی کا چراغ۔ بصیرت و بصارت اور عقل و دانشوری میں منارۂ نور کا نام ہے۔ موقف کی راستی، فکر کی صحت، عمل میں اخلاص وللّٰہیت، بے پناہ تبحر علمی اور حضرت علامہ کے بقول فقیری کی شان میں امیری کو مولانا مودودیؒ کہتے ہیں۔ تاریخ میں ایک سے ایک بڑھ کر نابغۂ روزگار اور عبقریِ زمانہ پیدا ہوئے، بڑے بڑے منصب پر فن کار، سیاست دان، محقق، ہادی و لیڈر اپنی جلوہ طرازی دکھا گئے۔ مگر ان سب کی کوششیں اور کارنامے کسی ایک میدان اور کسی ایک فن تک محدود رہے۔ ہندوستان کی جدید ترین تاریخ کو علامہ فراہیؒ جیسا مفسر و محقق، ابوالکلام جیسا خوش بیان خطیب اور آگ لگانے والا قلمکار، محمد علی جوہر جیسا بیباک مقرر، علامہ شبلی جیسا محقق، ان سب کی سیرتیں پڑھو، سب کی کوششیں اور سرگرمیاں کسی ایک خاص میدان تک محدود رہیں۔

مگر حیرت ہوتی ہے سیدی مودودیؒ کی زندگی پر کہ ایک طرف بہترین افکار و نظریات پر مشتمل ضخیم لٹریچر تیار کیا، دوسری طرف لاکھوں نوجوانوں کی سیرت سازی کا سب سے مشکل کام کر دکھایا، تیسری طرف تحریکِ اسلامی کی قیادت کی، دن دن بھر دوروں کا پروگرام، تقریریں، ملاقاتیں سب کچھ انجام دیا اور چوتھی طرف ملک کے لادینی عناصر سے ٹکر بھی لی۔ یہی نہیں بلکہ اپنوں اور علماء کی طرف سے بھی تیز و تند حملوں کو برداشت کیا۔

مرشدی مودودیؒ نوجوانوں کے باپ اور شفیق باپ تھے۔ آج ہمارا یہ باپ ہم سے جدا ہو کر اپنے رب سے جا ملا ہے، اب ہم نوجوانوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ:

- ہمارا وطن بھارت تہذیبی جارحیت کا شکار رہے گا؟
- یہ غیروں کے در پر دستِ سوال دراز کرتا رہے گا؟
- یہاں اخلاقی اقدار پامال ہوتے رہیں گے؟
- نوجوانوں کا استحصال ہوتا رہے گا؟

یا

ہم مولانا مودودیؒ کے عقیدت مند اسلام پسند نوجوان اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ملک کو تباہی سے بچانے کی کوشش کریں گے۔نوجوانوں کو بروقت آگاہ کریں گے اور ملک کی تعمیر میں ان کے کردار سے روشناس کرائیں گے۔

دوستو! آؤ ہم بہت رو چکے۔ اب اپنے آنسو خشک کریں۔ ہم اپنی رقتوں، سسکیوں اور آہوں کو ترنم میں تبدیل کرائیں۔ فضا کی سوگواری ختم کریں۔ اور اب ہم سب پوری یکسوئی اور کامل توجہ کے ساتھ اس مشن کی تکمیل میں لگ جائیں جو ہم سب کے مرشد، ہم سب کے شفیق باپ اور ہم سب کے رہبر نے چھوڑا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ

(اداریہ، ماہنامہ حیات نو، شمارہ نمبر 10۔اکتوبر 1979ء)

☆☆☆

| تم یاد کرو گی یا میں |
| --- |
| امریکہ روانگی سے قبل ایک روز کھانے پر ہماری والدہ نے ایک سالن آگے کرتے ہوئے کہا: میاں صاحب! آپ بھی کھالیں کیا یاد کریں گے۔مولانا نے فوراً جواب دیا: "تم یاد کرو گی یا میں یاد کروں گا۔" والد مرحوم کی ہر بات معنی خیز ہوتی تھی۔ (حسین فاروق مودودی) |

عمار جاوید خان[1]

# عرب جامعات میں داخلہ: طریقہ کار اور رہنمائی

(خصوصی ویڈیو)

سعودی عرب کی جامعات میں داخلے کے طریقۂ کار میں گزشتہ برسوں میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ پہلے طلبہ کو ہر یونیورسٹی میں الگ الگ درخواست دینی ہوتی تھی، لیکن اب سعودی وزارتِ تعلیم نے Study in KSA کے نام سے ایک مرکزی پورٹل متعارف کرایا ہے، جہاں سے مختلف جامعات میں داخلے کے لیے آن لائن درخواست دی جاسکتی ہے۔ اسلامی علوم کے طلبہ کے لیے سعودی جامعات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تخصص کے اعتبار سے:

قرآنیات کے لیے کنگ سعود یونیورسٹی۔ علومِ حدیث کے لیے اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ ۔ فقہ، اصولِ فقہ اور مقاصدِ شریعت کے لیے امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی۔ عربی ادب کے لیے ام القریٰ یونیورسٹی نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ تاہم عصری علوم کے طلبہ کو دیگر ممالک اور جامعات کے مواقع کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کیونکہ مختلف شعبوں میں داخلے اور سہولتوں کے امکانات مختلف ہوسکتے ہیں۔

طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ درخواست دینے سے قبل متعلقہ یونیورسٹی کی موجودہ پالیسی، فیس، اسکالرشپ، رہائش اور دیگر سہولتوں کی مکمل معلومات حاصل کریں۔ نیز Study in KSA پورٹل پر درخواست دینے کی مقررہ تاریخوں کا خیال رکھتے ہوئے بروقت کارروائی کریں۔

ویڈیو میں پیش کی گئی گفتگو کا یہ مختصر خلاصہ ہے۔ مزید تفصیلی معلومات اور عملی رہنمائی کے لیے قارئین صفحہ نمبر 127 پر موجود QR Code اسکین کرکے مکمل ویڈیو سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

---

[1] برادر عمار جاوید خان، جامعۃ الفلاح کے فارغ التحصیل اور امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی، ریاض کے ہائر انسٹی ٹیوٹ آف جوڈیشری (Higher Institute of Judiciary) میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ عرب جامعات، خصوصاً سعودی عرب میں داخلے کے طریقہء کار اور طلبہ کے مواقع سے متعلق ان کی یہ ویڈیو مفید رہنمائی پیش کرتی ہے۔

ابنِ ابوبٹن

# آن لائن مشاعرہ: بزمِ سخن سے بزمِ زوم تک

(مزاحیہ انشائیہ)

زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ کبھی مشاعرے چراغوں، قالینوں، اسٹیج اور سامعین سے بھرے ہالوں کی زینت ہوا کرتے تھے۔ پھر مائیک اور لاؤڈ اسپیکر کا دور آیا، اور اب مشاعرہ اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ شاعر اپنے کمرے میں آرام فرما ہوتا ہے، سامع اپنے بستر یا صوفے پر تشریف رکھتے ہیں، اور دونوں کے درمیان ادب کا رشتہ وائی فائی کے نازک دھاگے سے بندھا ہوتا ہے۔

پہلے شاعر کو مشاعرے کے لیے لباس درست کرنا پڑتا تھا، گھر سے نکلنا پڑتا تھا، سفر کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، اب معاملہ یہ ہے کہ اوپر شیروانی، ٹوپی یا واسکٹ پہن لیجیے اور نیچے آرام دہ لباس کے ساتھ پوری شان سے اسکرین پر جلوہ گر ہو جائیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی ٹیکنالوجی اتنی ترقی نہیں کر سکی کہ سامع شاعر کو مکمل 360 ڈگری زاویے سے دیکھ سکے، ورنہ کئی گھریلو راز بھی ادب کے ذخیرے میں شامل ہو جاتے۔

آن لائن مشاعرہ جدید دور کا وہ عجوبہ ہے جس میں ہر شخص اپنی پسندیدہ کیفیت میں ادب کی خدمت انجام دیتا ہے۔ کوئی کرسی پر باقاعدہ بیٹھا ہے، کوئی صوفے پر نیم دراز ہے، اور کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے چہرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشاعرے اور نیند کے درمیان کسی نازک سرحد پر سفر کر رہے ہیں۔

بعض اوقات کیمرہ بھی اپنی الگ داستان سناتا ہے۔ کبھی شاعر کا چہرہ اتنا قریب ہوتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے غزل نہیں بلکہ شناختی کارڈ کا نیا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے، اور کبھی منظر ایسا ہوتا ہے کہ سامع شعر سننے کے بجائے پس منظر میں رکھی الماری، پردے اور دیوار کی آرائش پر تحقیق شروع کر دیتا ہے۔

پھر بعض اوقات شاعر کے پیچھے گھر کا ماحول بھی مشاعرے کا حصہ بن جاتا ہے۔ کسی کمرے سے آواز آتی ہے:

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے!"

اور شاعر ایک لمحے کے لیے بحرِ سخن سے نکل کر بحرِ خانہ داری میں داخل ہو جاتا ہے۔

شاعر کلام شروع کرتا ہے تو پہلی داد اکثر سامعین سے پہلے گھر والوں کی طرف سے آتی ہے۔ ابھی مطلع مکمل بھی نہیں ہوا ہوتا کہ آواز آتی ہے:

"واہ! کیا خوب!"

اب یہ داد شعر کے لیے ہے یا گھر کے فرد کی حوصلہ افزائی کے لیے، یہ راز اکثر پردۂ غیب میں رہتا ہے۔

آن لائن مشاعرے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں سامع صرف شعر نہیں سنتا بلکہ دوسروں کی روزمرہ زندگی کا مشاہدہ بھی کرتا رہتا ہے۔ کوئی چائے پی رہا ہے، کوئی بسکٹ کھا رہا ہے، اور کوئی کھانے کی پلیٹ سامنے رکھے ادب کی آبیاری کر رہا ہے۔

بعض حضرات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشاعرہ اور کھانے کی مجلس نے باقاعدہ اتحاد کر لیا ہے؛ شعر بھی جاری ہے اور رزق کی تقسیم بھی۔

آن لائن مشاعرے کے ناظمِ محفل کی کیفیت بھی کسی کمانڈر سے کم نہیں ہوتی۔ اسکرین پر پھیلے ہوئے بیس پچیس خانوں میں نظریں دوڑاتے ہوئے وہ بیک وقت شاعر کو دعوت بھی دے رہا ہوتا ہے، کسی کا مائیک بند کر رہا ہوتا ہے، کسی کو یاد دلا رہا ہوتا ہے کہ جناب! آپ کی آواز ابھی تک دنیا تک نہیں پہنچی، اور کسی کو یہ سمجھا رہا ہوتا ہے کہ آپ کا کیمرہ آپ کے بجائے چھت کو دکھا رہا ہے۔

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناظمِ مشاعرہ نہیں بلکہ کسی فضائی مرکز کا کنٹرول روم چلا رہا ہے، جہاں شاعروں کی پروازیں مسلسل اڑان بھر رہی ہیں اور سگنل کے مطابق لینڈ بھی کر رہی ہیں۔

صدرِ محفل کی داستان بھی اپنی جگہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ روایتی مشاعرے میں صدرِ محفل کی سب سے بڑی خوبی یہ نہیں ہوتی کہ وہ بڑا شاعر، خطیب یا دانش ور ہو، بلکہ کبھی کبھی اصل کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر تک اپنی نشست پر قائم رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

شاعر اپنا کلام سنا کر سبک دوش ہو جاتا ہے، سامعین کبھی چائے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں

اور کبھی موبائل کی طرف، مگر صدرِ محترم؟

وہ ابتدا سے انتہا تک ایسے موجود رہتے ہیں جیسے زوم کی پوری محفل کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہو اور اختتام کا بٹن بھی انہی کے پاس ہو۔

آن لائن مشاعرے میں صدرِ محفل کی آزمائش کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ ایک طرف انہیں شعر سننا ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اسکرین پر کتنے لوگ ابھی تک موجود ہیں۔ کیونکہ آن لائن دنیا میں بعض اوقات سامع کی غیر موجودگی بھی بڑی خاموش ہوتی ہے؛ نہ دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے، نہ قدموں کی چاپ، بس ایک دم ایک خانہ خالی ہو جاتا ہے۔

مشاعرہ اختتام کے قریب پہنچتا ہے تو صدرِ محترم کے کان آہستہ سے عرض کرتے ہیں:

"حضور! ہم نے بھی ادب کی کافی خدمت کر لی ہے، اب کچھ آرام کا موقع عطا فرمایا جائے۔"

مگر منصب کا تقاضا یہ ہے کہ چہرے پر وہی تازگی برقرار رہے، جیسے ابھی ابھی محفل شروع ہوئی ہو۔

صدرِ محفل کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ بیک وقت شاعر کو داد بھی دے، محفل کی رونق بھی قائم رکھے اور اپنی تھکن کو بھی مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لے۔

آن لائن مشاعرے کی چند مشکلات بھی اپنی جگہ ہیں۔ بعض سامعین کیمرہ بند کر کے ایسی خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ آخر تک معلوم نہیں ہو پاتا کہ وہ شعر سن رہے ہیں، سو رہے ہیں یا کسی اور مصروفیت میں مشغول ہیں۔

کچھ حضرات تو اختتام کے قریب اچانک نمودار ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"بہت عمدہ نشست تھی!"

حالانکہ دل میں سوال اٹھتا ہے کہ عمدگی مشاعرے کی تھی یا آرام دہ نشست کی؟

کچھ سامعین ایسے بھی ہوتے ہیں جو پورے مشاعرے میں خاموش رہتے ہیں، نہ داد، نہ تبصرہ، نہ کوئی ردِ عمل۔ آخر میں صرف ایک پیغام بھیجتے ہیں:

"بہت خوب!"

اب یہ "بہت خوب" کس شعر کے لیے ہے، کس شاعر کے لیے ہے یا صرف اپنی موجودگی کا ثبوت دینے کے لیے، اس کا فیصلہ کرنا بھی ایک ادبی تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔

ان تمام دلچسپ پہلوؤں کے باوجود آن لائن مشاعرہ ایک بڑی نعمت بھی ثابت ہوا ہے۔ اس نے فاصلے سمیٹ دیے ہیں۔ اب دوحہ، دہلی، لکھنؤ، کراچی، لندن، ٹورنٹو اور جدہ کے اہلِ ذوق ایک ہی وقت میں ایک ہی محفل میں شریک ہو سکتے ہیں۔ نہ سفر کی مشقت، نہ ہوٹل کی بکنگ، نہ ہال کا کرایہ، نہ استقبالیہ کمیٹی کی فکر؛ بس ایک لنک جاری ہوا اور دنیا بھر کے شعر دوست ایک ہی بزم میں جمع ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ آن لائن مشاعرہ اب صرف مجبوری نہیں، ادب کی ایک نئی سہولت بھی بن چکا ہے۔ اس نے شاعری کو شہروں اور سرحدوں کی قید سے نکال کر عالمی مجلس عطا کر دی ہے۔

البتہ ہر نعمت کے ساتھ کچھ آزمائشیں بھی ہوتی ہیں۔

پہلے شاعر مشاعرے میں دیر سے پہنچتا تھا، اب کبھی کبھی انٹرنیٹ کو شاعر تک پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے۔

پہلے ناظم اعلان کرتا تھا:

"شاعرِ محترم اسٹیج پر تشریف لائیں۔"

اب کہتا ہے:

"جناب آپ سے گذارش ہے کہ آپ اسکرین پر تشریف لائیں اور اپنا مائیک آن کر لیجیے"

پہلے داد دینے کے لیے ہاتھ اٹھتے تھے، اب صرف انگوٹھا کافی ہے۔ عجیب زمانہ آ گیا ہے؛ جو انگوٹھا کبھی "انگوٹھا ٹیک" ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا، وہی اب کسی کی قابلیت پر مہرِ تصدیق بن کر آتا ہے۔

پہلے مشاعرے کے بعد شاعر سے مصافحہ ہوتا تھا، اب Leave Meeting پر کلک ہوتے ہی گھنٹوں کی ادبی رفاقت بھی چند سیکنڈ میں ختم ہو جاتی ہے۔

بعض حضرات کی انٹرنیٹ اسپیڈ بھی شاعری کی بحر کی طرح ہوتی ہے؛ کبھی رواں، کبھی ٹوٹی ہوئی۔ آدھا شعر سنائی دیتا ہے، باقی سامع اپنے ذوق سے مکمل کر لیتا ہے۔

اور اگر کسی شاعر کا سگنل عین شعر کے مقطع پر رک جائے تو سامعین کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

غزل بھی سسپنس ناول بن گئی ہو۔

بہرحال، ادب زندہ ہے، شعر زندہ ہے اور مشاعرہ بھی زندہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے شاعر اسٹیج پر نمودار ہوتا تھا، اب اسکرین پر۔ پہلے داد ہال میں گونجتی تھی، اب ایموجیز کی صورت میں برستی ہے۔ پہلے محفل بجلی پر چلتی تھی، اب بجلی کے ساتھ وائی فائی، مائیک، کیمرہ اور Unmute کے رحم و کرم پر بھی۔

خدا کرے شاعر کا تخیل، سامع کا ذوق، صدرِ محفل کا صبر، ناظم کی برداشت اور انٹرنیٹ کا سگنل ہمیشہ مضبوط رہے؛ کیونکہ آج کل ان پانچوں میں سے کسی ایک نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو پورا مشاعرہ غزل سے زیادہ غائب ہونے والوں کی حاضری لینے میں گزر جاتا ہے۔

ابنِ ابوبٹّن کا کہنا ہے کہ آن لائن مشاعرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر شعر پسند نہ آئے تو سامع خاموشی سے کیمرہ بند کر سکتا ہے، اور شاعر آخر تک یہی سمجھتا رہتا ہے کہ سامع پوری توجہ سے اس کی غزل سن رہا ہے۔

☆☆☆

خبیب کاظمی

# نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نورِ رشد و ہدایت پہ لاکھوں سلام
آفتابِ نبوت پہ لاکھوں سلام

پیکرِ امن و راحت پہ لاکھوں سلام
منبعِ صلح و رحمت پہ لاکھوں سلام

آ گئے بن کے سارے جہاں کے امام
شاہِ عالم کی بعثت پہ لاکھوں سلام

ان کی برحق صفت ہے رؤف و رحیم
مجتبیٰ کی مودت پہ لاکھوں سلام

بن کے آئے وہ رحمت جہاں کے لیے
ان کی جود و سخاوت پہ لاکھوں سلام

اس سے حاصل خدا کی محبت ہوئی
مصطفیٰ کی اطاعت پہ لاکھوں سلام

منتظر روزِ محشر ہیں عاصی تمام
تاجدارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

جس سے روشن ہوئی بزمِ کون و مکاں
اس تجلیٔ رحمت پہ لاکھوں سلام

چومنے خاکِ طیبہ چلے جب خبیبؔ
چشمِ تر کی عبادت پہ لاکھوں سلام

سرفراز بزمی، سوائی مادھو پور راجستھان

# اے ہلال سال نو!

اے ہلال سال نو ! اے بام گردوں کے مکیں
تو نے دیکھے ہیں ہزاروں انقلابات زمیں

تو نے دیکھا ہے جہان قیصریت کا زوال
تو نے دیکھا ہے عروج مزدکیت پائمال

تو نے ان اقوام کی دستار دیکھی خاک پر
جن کی قسمت کے ستارے تھے بلند افلاک پر

تو نے دیکھی ان شہنشاہوں کی شوکت پائمال
"جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال"

ٹوٹتے دیکھے ہیں تو نے ان شہنشاہوں کے تاج
ابر پاروں سے لیا کرتے تھے جو ظالم خراج

بابل و یونان کے دیوار و در سوتے ہوئے
تو نے دیکھا ہے انہیں زیر و زبر ہوتے ہوئے

بحر جب خاموش تھا فرعون کے انجام پر
تیری کرنیں ضوفگن تھی مصر کے اہرام پر

نیل کے پانی پہ چمکا طور کے کہسار پر
بابل و یونان کے خفتہ در و دیوار پر

تو نے ہنگامے بھی دیکھے جشن بھی ادبار بھی
چاہ یوسف بھی عزیز مصر بھی بازار بھی

بزم عالم کے ہر اک ہیجان کا شاہد ہے تو
اس زمین پر نوح کے طوفان کا شاہد ہے تو

زلزلے دیکھے زمیں پر سینکڑوں آتش فشاں
اے کہ تو بام فلک پر ہے زمیں کا راز داں

نجد کے صحرا میں سب آہو ترے پالے ہوئے
تھے تری چھاؤں میں ہم لنگر کبھی ڈالے ہوئے

کیا سمرقند و بخارا کوفہ و بغداد تھے
ہو گئے ویراں وہ کاشانے جو کل آباد تھے

کیا ہوا آخر کہ ویراں ہو گیا اپنا چمن
تھے کبھی ہم بھی تری محفل میں شمع انجمن

یوں ندا آئی فلک سے اے شہید جستجو
تازہ دم رکھتا ہے دنیا کو ترا تازہ لہو

آج بھی امید کا مرکز ہے بس تیرا ایاغ
بحر پیما کے لیے جیسے جزیرے کا چراغ

بزم فطرت صرف ہم آہنگ ہے اس ساز سے
ڈر لگا رہتا ہے نمرودوں کو جس آواز سے

وہ رہا دنیا کی تہذیبوں کا سارا کر و فر
بابل و یونان و مصرو روم کے ویراں کھنڈر

آفتاب ہجر ہو یا روئے مہتاب وصال
عالم فانی میں ہر شیء کا مقدر ہے زوال

یہ جبین بزم عالم پر عیاں تحریر ہے
روز روشن ہر شب تاریک کی تقدیر ہے

آہ ناداں تو نے سمجھا ہی نہیں اب تک یہ راز
تیرا نغمہ موسموں کی گردشوں سے بے نیاز

سینکڑوں صدیوں کی ویرانی رلاتی ہے تجھے
اپنی خوئے نامسلمانی رلاتی ہے تجھے

مشرق و مغرب میں ہے ہر سمت تیرا انتظار
دیکھ پھر آنے کو ہے تیرے گلستاں میں بہار

دیکھ طغیانی چھپی ہے ہر دل خاموش میں
کتنے طوفاں پل رہے ہیں بحر کی آغوش میں

مزدکیت ہو کہ ہو امریکیت جانے کو ہے
آمریت سلطنت صیہونیت جانے کو ہے

بزم عالم میں ہر اک جانب بس اک آواز ہے
"اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے"

"مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے"

☆☆☆

شبنم سبحانی

# ترانۂ فلاح

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح
مصدرِ کلمۂ حق ہے در و دیوارِ فلاح
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

اے کہ ذروں میں ترے بوئے یقیں، ذوقِ سجود
پرتو افگن تری محرابوں پہ انوارِ وجود
مفت ہاتھ آئے ہیں مستوں کو یہاں جامِ شہود
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

ناز ہے ہم کو کہ ہم تیرے جگر بند ہوئے
اہلِ صفہ کی طرح ہم بھی برومند ہوئے
سادگی اور قناعت پہ رضا مند ہوئے
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

کتنی رعنائیاں تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ریزے الماس و گہر کے جو تری خاک میں ہیں
بجلیاں ایسی کہاں گنبدِ افلاک میں ہیں
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

روشنی ہم کو ملی ہے تری قندیلوں سے
آگہی ہم کو ملی ہے ترے جبریلوں سے
زندگی ہم کو ملی ہے ترے مندیلوں سے
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

تیری کلیوں کی بشاشت تیرے پتوں کا نکھار
تیری شاخوں کی لچک اور تیرے غنچوں کا وقار
نقش ہے دل پہ ترا پیکرِ گل روئے نگار
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

تیرے کوزوں میں نہاں ہم نے سمندر پایا
تیرے ذروں میں جمالِ مہ و اختر پایا
تیرے ویرانے میں اک پھولوں کا لشکر پایا
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

ذہن شاداب ہوا عقل کو برنائی ملی
دل کو شائستگیِ انجمن آرائی ملی
دست و بازو کو یہاں قوتِ صحرائی ملی
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

تیرے کانٹوں سے لیا درسِ تمنا ہم نے
تیرے قطروں سے سنی قرأتِ دریا ہم نے
تیرے ذروں میں پڑھی آیتِ صحرا ہم نے
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

تیشۂ جہد و عمل تجھ سے چلانا سیکھا
پرچمِ حسنِ عمل تجھ سے اٹھانا سیکھا
کوہِ نخوت کو بھی ٹھوکر سے گرانا سیکھا
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

یاد فردوس کی آئے وہ فضا تیری ہے
دل میں طوفان اٹھائے وہ ہوا تیری ہے
ہے، یہ تکبیرِ مسلسل کی صدا تیری ہے
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بارِ فلاح
ہے ہمالہ سے بھی اونچا مرا مینارِ فلاح

سعید اختر اعظمی ریاض سعودی عرب

# غزل

خوشا نصیب بنا ہے جو نامہ بر کاغذ
حنائی دست نے کر ڈالا معتبر کاغذ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ان پہ کیا لکھوں
پڑے ہوئے ہیں کئی میری میز پر کاغذ

عجیب چیز ہے اشکوں کی روشنائی بھی
لکھا، مٹایا، ملا مجھ کو پھر بھی تر کاغذ

وصال و ہجر کے احوال سب رقم کر دوں
وہ لمحہ خوب ہو بن جائے دل اگر کاغذ

سخن وری کی فضا سازگار ہے اختر
رواں ہے خامہ مرا اور ہم سفر کاغذ

☆☆☆

سالم سلیم

# غزل

یار ہیں اس کے طرف داروں کے بیچ
میں اکیلا پڑ گیا یاروں کے بیچ

تیری زلفوں سے رہا ہونے کے بعد
ہم بہت بھٹکے ہیں رخساروں کے بیچ

موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
میں ہی بس اچھا ہوں بیماروں کے بیچ

اے خدا تو ہی بتا آخر میں کیوں
گھومتا جاتا ہوں سیاروں کے بیچ

گھر سے خوش قامت وہ نکلا ہی نہیں
اور قیامت سی ہے بازاروں کے بیچ

گھر بنانے میں کٹی ہے زندگی
لگ چکے ہیں ہم بھی دیواروں کے بیچ

ہر طرف اللہ اکبر کا ہے شور
گھر گئی ہے خامشی نعروں کے بیچ

شاکرالاکرم ۔بھوپال

# غزل

ہم پہ وہ ستم بعد ستم کرتے رہیں گے
کیا پھر بھی سرِ ناز کو خم کرتے رہیں گے

شرمندۂ احسان رہیں گے یونہی کب تک
کب تک وہ یونہی ہم پہ کرم کرتے رہیں گے

اس دل پہ حکومت ہے فقط ایک خدا کی
کس کس کو زمانے میں صنم کرتے رہیں گے

جس دل میں تو بستا ہے وہی میرا حرم ہے
دل جان سدا نذر حرم کرتے رہیں گے

اس دشت کی تقدیر بدل جائے گی اک دن
ہم خون سے اس دشت کو نم کرتے رہیں گے

ہوشیار و خبردار زمانے کو کرے کون
واعظ اگر دینار و درم کرتے رہیں گے

دم لیں گے مٹا کر کے ہر اک دل سے کدورت
ہم اہل حرم سب پہ کرم کرتے رہیں گے

تصویر، ترتیب وپیشکش: محمد ارشاد عالم فلاحی ۔ دھلی[1]

# جامعۃ الفلاح: ایک تعارف

(خصوصی ویڈیو)

مادرِ علمی جامعۃ الفلاح کی تاریخ، تعلیمی وتربیتی نظام، علمی خدمات، مختلف شعبہ جات، طلبہ کی سرگرمیوں اور مستقبل کے منصوبوں پر مشتمل ایک جامع تعارفی ویڈیو پیش کی جارہی ہے۔ یہ ویڈیو اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں تیار کی گئی ہے، تاکہ دنیا بھر میں جامعہ سے وابستہ افراد اور دیگر قارئین اس سے استفادہ کرسکیں۔ مکمل تعارفی ویڈیو دیکھنے کے لیے صفحہ نمبر 127 پر دیے گئے متعلقہ QR Code کو اسکین کریں اور اپنی پسندیدہ زبان میں جامعۃ الفلاح کے تعلیمی وتربیتی سفر سے آگاہی حاصل کریں۔

[1] برادر محمد ارشاد عالم فلاحی گزشتہ دو دہائیوں سے زائد عرصے سے میڈیا اور صحافت کے شعبے سے وابستہ ممتاز ملٹی میڈیا پروڈیوسر ہیں۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے وایم اے (اسلامک اسٹڈیز)، دِگلوبل اوپن یونیورسٹی سے ایم بی اے (مینیجمنٹ) کی ڈگری حاصل کی۔ مختلف معروف میڈیا اداروں میں خدمات انجام دینے کے بعد وہ میڈیا اور ابلاغ کے میدان میں نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔
انہوں نے اپنی مادرِ علمی جامعۃ الفلاح کی اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں تعارفی ویڈیوز کے علاوہ جماعتِ اسلامی ہند، الشفا ہاسپٹل، ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن اور دیگر فلاحی اداروں کے لیے بھی معیاری دستاویزی فلمیں تیار کی ہیں۔ میڈیا کے ذریعے تعلیمی، تحریکی اور فلاحی خدمات کو اجاگر کرنے کے حوالے سے ان کی کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔ (ایڈیٹر)

ترتیب: مصباح الباری

# جامعہ میں نئی تقرریاں

جامعۃ الفلاح میں تعلیمی وانتظامی امور کو مزید مستحکم اور فعال بنانے کے لیے اس سال مختلف شعبہ جات میں انٹرویوز کے تین مراحل کے ذریعے نئی تقرریاں عمل میں آئی ہیں۔ نو وارد اساتذہ اور ملازمین کی شعبہ وار تفصیل درج ذیل ہے:

## شعبۂ اعلیٰ:

- طالبات : حنا نسیم، ازکیٰ معین، انعم خان، شفاء معین، اقصیٰ فیضان، نداء ضیاء الدین صاحبان۔
- طلبہ : عبدالستار قاسمی، اسامہ نسیم صاحبان

## شعبۂ ثانوی:

- طالبات : فوزیہ بانو، خوشنما ریاض، مریم شمیم، ازکیٰ اجمل، ناز جہانگیر صاحبان۔
- طلبہ : محمد شاویز، ابوحمزہ فلاحی صاحبان۔

## شعبۂ ابتدائی:

- طالبات : فلک سہراب، نسیمہ جاوید، صفیہ سنبل، لبنیٰ فاروق، اریبہ بانو، زینب سراج، تبسم عرفان صاحبان۔
- طلبہ : محمد ارشد احسان، شفیع الرحمن عبید، ثاقب عمران، محمد حسین صاحبان۔

## شعبۂ حفظ:

| | | |
|---|---|---|
| – حفظ طلبہ | : | ارشاد عالم فلاحی صاحب |

## دیگر شعبہ جات وانتظامی ذمہ داریاں:

| | | |
|---|---|---|
| – اعلیٰ، نسواں فیس کاؤنٹر | : | نورفشاں غفران صاحبہ |
| – دفترِ تعلیمات | : | انس رمان صاحب |
| – ایڈمنسٹریٹر | : | عبداللہ محفوظ صاحب |
| – مطبخ | : | ارحم شیخ صاحب |
| – میڈیا ہاؤس | : | ابواسامہ صاحب |
| – تنظیمِ مکاتب | : | عارف بخت صاحب |
| – اتالیقہ صفیہ منزل | : | آسیہ شغف صاحبہ |

اللہ تعالیٰ تمام ہی نو واردین کو اپنی ذمہ داریاں حسن وخوبی کے ساتھ انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

# دوروزہ تربیتی ورکشاپ

جامعۃ الفلاح میں اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں میں بہتری اور تعلیمی معیار کے فروغ کے لیے وقتاً فوقتاً تربیتی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔اسی سلسلے میں 2اور 3 جون 2026ء کو جامعہ کے ابواللیث ہال اور مرکزی لائبریری میں معلمین ومعلمات کے لیے دوروزہ تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔

ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں مہتمم تعلیم وتربیت ڈاکٹر جاوید سلطان خان فلاحی نے اساتذہ کو تدریس کو عبادت سمجھ کر انجام دینے،طلبہ کی تربیت اور اپنے کردار کو نمونہ بنانے کی تلقین کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد مولانا نیاز احمد ندوی صاحب نے" تدریس کے رہنما اصول" پر گفتگو کرتے ہوئے محبت،محنت اور عملی نمونے کو کامیاب تدریس کی بنیاد قرار دیا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمود عبدالرب مرزا فلاحی نے سبق کی منصوبہ بندی اور تدریسی حکمتِ عملی پر روشنی ڈالی،جبکہ جناب سراج الدین فلاحی صاحب نے امتحانی پرچوں کی تیاری کے اصول بیان کیے۔ بعدازاں شعبۂ اعلیٰ،ثانوی،حفظ اور ابتدائی درجات کے اساتذہ نے مختلف مضامین کے نمونے کے اسباق (Model Lessons) پیش کیے۔

دوسرے دن" جنریشن الفا اور بچوں کی نفسیات" کے موضوع پر گفتگو ہوئی،جس میں جدید ٹیکنالوجی کے مثبت استعمال اور نئی نسل کے تعلیمی ونفسیاتی تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی۔مہمانِ خصوصی جناب ایس امین الحسن صاحب نے بچوں کی عمر کے مختلف مراحل کے لحاظ سے تربیتی اصول بیان کیے اور اساتذہ کو بچوں کے ساتھ حکمت،محبت اور دوستانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔

ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں سابق ناظمِ جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی۔نظامت کے فرائض مولانا مصباح الباری ندوی صاحب نے انجام دیے۔اس دوروزہ تربیتی پروگرام میں جامعہ کے اساتذہ ومعلمات نے بھرپور شرکت کی۔

ورکشاپ اور اہم لیکچرز کی ویڈیوز

اس دوروزہ تربیتی ورکشاپ کے اہم سیشنز اور منتخب لیکچرز کی ویڈیوز کے لیے حیاتِ نو کے صفحہ نمبر 127 پر موجود QR کوڈز اسکین کریں۔

| QR کوڈ کا نمبر | ویڈیو کا عنوان |
|---|---|
| 7 | دوروزہ تربیتی ورکشاپ (افتتاحی سیشن) |
| 8 | ورکشاپ۔مختلف لکچرز۔تدریسی نمونے |
| 6 | جنریشن الفا اور بچوں کی نفسیات کا مطالعہ۔ایس۔امین الحسن صاحب |
| 5 | بچوں کے ارتقائی مراحل کی نفسیات: ایس۔امین الحسن صاحب |

☆☆☆

قارئینِ کرام سے ایک خاص التماس!

ایک طویل وقفے کے بعد ’حیاتِ نو‘ کا یہ نیا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔خود بھی اس کا مطالعہ کیجیے اور اسے دیگر فلاحی و غیر فلاحی احباب تک بھی ذوق وشوق سے پہنچایئے۔

مجلّے کو مزید مفید اور معیار پر پورا اتارنے کے لیے آپ کی گراں قدر آراء بے حد ضروری ہیں۔ برائے مہربانی اپنی تحریری تجاویز و آراء ہمارے آفیشل ای میل (hayatenau@gmail.com) پر ہی ارسال فرمائیں تاکہ آپ کا فکری تعاون ہمارے پاس محفوظ رہے۔

(ادارہ)

# اپنی شخصیت کی تعمیر کیسے کریں؟

جمعیۃ الطلبہ کے زیرِ اہتمام ۲۶ اپریل ۲۰۲۶ء کو ابواللیث ہال میں شعبۂ اعلیٰ کے طلبہ کے لیے ایک فکری نشست منعقد ہوئی، جس کا عنوان "اپنی شخصیت کیسے بنائیں؟" تھا۔نشست کے مہمانِ خصوصی بنگلور کے معروف جنرل فزیشن، ماہرِ تعلیم اور سماجی شخصیت ڈاکٹر طہ عبدالمتین صاحب تھے۔ پروگرام کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا، جبکہ مصباح الباری فلاحی ندوی صاحب نے مہمانِ خصوصی کا تعارف پیش کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر طٰہٰ عبدالمتین صاحب نے شخصیت سازی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے علم کے حقیقی مقصد، فکری تربیت، اخلاق و کردار کی تعمیر اور ایک فلاحی کی دعوتی و سماجی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے طلبہ کو صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ میں رنگنے)، نفع بخش علم حاصل کرنے، معاشرے کی اصلاح کے لیے حق گوئی اختیار کرنے اور آخرت کی جواب دہی کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کی تلقین کی۔

آخر میں مہتمم تعلیم و تربیت ڈاکٹر جاوید سلطان خان فلاحی صاحب نے کلمۂ تشکر پیش کیا اور ڈاکٹر صاحب کی علمی گہرائی، قرآنی آیات کو سائنسی و فکری نکات سے مربوط کرنے اور طلبہ کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کرنے کی صلاحیت کو سراہا۔

ڈاکٹر طہ عبدالمتین صاحب کا مکمل خطاب سننے کے لیے صفحہ نمبر 127 میں دیے گئے QR Code نمبر 12 اسکین کریں۔

شعبۂ اعلیٰ کی طالبات کے لیے بھی ڈاکٹر صاحب کا ایک خصوصی خطاب منعقد کیا گیا۔

☆☆☆

# فنِ خطابت اور اس کے آداب

جمعیۃ الطلبہ کے زیرِ اہتمام، ۲۱ مئی ۲۰۲۶ء کو ابواللیث ہال میں ایک تربیتی نشست منعقد ہوئی، جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر موجود سابق ناظم جامعہ مولانا طاہر مدنی صاحب نے "فنِ خطابت اور اس کے آداب" کے عنوان سے طلبہ کو خطاب کیا۔

مولانا نے مؤثر خطابت کو دعوت و اصلاح کا اہم ذریعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایک اچھے خطیب کے لیے وسیع مطالعہ، اخلاص، تیاری، حسنِ اخلاق اور زبان پر قدرت ضروری ہے۔ انہوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ روزانہ مطالعہ کریں، تقریر کی مشق کریں، اپنی گفتگو کا جائزہ لیں اور خطابت میں اعتدال، حکمت اور مستند حوالوں کا اہتمام کریں۔

نشست کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا اور اختتام پر ناظمِ اجلاس کے کلماتِ تشکر کے ساتھ ہوا۔ خطاب کے بعد اعلان کیا گیا کہ بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں تقریری مقابلہ طئے پایا ہے۔

(مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے مکمل خطاب کی ویڈیو دیکھنے کے لیے "حیاتِ نو: ڈیجیٹل کارنر" (صفحہ نمبر 127) پر موجود کیوآر کوڈ نمبر 3 اسکین کریں۔)

☆☆☆

# جمعیۃ الطلبہ وطالبات کے لیے نئی میقات کا آغاز

جامعۃ الفلاح میں زیرِ تعلیم طلبہ وطالبات کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، ان میں قائدانہ اوصاف پیدا کرنے اور تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے جمعیۃ الطلبہ و جمعیۃ الطالبات اساتذہ کی نگرانی میں سرگرمِ عمل ہیں۔ دونوں تنظیمیں ہفتہ واری مجالس، سالانہ مقابلوں، وال میگزینز اور دیگر ادبی وثقافتی سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ کی ہمہ جہت تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نئی تعلیمی میقات ۲۰۲۶۔۲۰۲۷ء کے لیے دونوں تنظیموں کے نومنتخب عہدیداران اور شعبہ جاتی ذمہ داران درج ذیل ہیں:

| ذمہ داریاں | جمعیۃ الطلبہ | جمعیۃ الطالبات |
|---|---|---|
| سکریٹری | اویس اجمیر علی (سیتاپور، یوپی) | حبیبہ شاہد |
| معاون سکریٹری | | ادیبہ فروغ |
| لائبریرین | اسلم انصاری (سپول، بہار) | زینت اعجاز، علمیٰ ذکی |
| معتمد خطابت | رضاء الحق (بہار) | فرحین اختر۔ معاون، اسماء دانش |
| معتمد کتابت | مظہر الیاس (نیپال) | ام فضیلت فیضان احمد، صفورہ شمیم |
| معتمد کھیل | مبشر خان ساجد (مہاراشٹر) | مغفرہ فاطمہ، صحیفہ ثناء اللہ |
| شعبۂ رسائل وجرائد | | سدا شبنمی، زینت مرصاد |
| شعبۂ باغبانی | | عائشہ عبدالصمد، رفعت امتیاز |

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام نومنتخب، نونہال ذمہ داران کو اخلاصِ نیت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی بہترین فکری وعملی تربیت کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کو حسنِ خوبی سے نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اسامہ عظیم فلاحی

# حیاتِ نو کی حیاتِ تازہ

تنظیموں اور انجمنوں کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ جہاں انسان ہوں گے وہاں اختلافات ہوں گے۔ یہ اختلافات دائمی انتشار میں نہ بدل جائیں، اس بات کی کوشش ہونی چاہیے۔ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی تاریخ میں اتار چڑھاؤ ایک حقیقت ہے۔ سخت ترین اختلافات ہوئے لیکن بالآخر اتحاد کی طرف لوگوں نے قدم بڑھایا اور اس اتحاد کی افادیت کو سب نے محسوس کیا۔

گزشتہ چند سالوں میں انجمن طلبہ قدیم پھر سے انتشار اور جمود کا شکار ہوئی۔ انتخابات وقت مقررہ پر نہ ہوسکے۔ انجماد کی صورت میں انجمن کی بحالی کے لیے دستور میں کوئی شق نہ ہونے کی وجہ سے صورتحال مزید سنگین ہوگئی۔ عام فلاحیوں میں اس صورت حال کو لے کر بے چینی شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ بالآخر برادران فلاح کے درمیان سے ایک تحریک اٹھی جس نے کچھ اہداف طے کیا۔ سب سے پہلے مادر علمی کے زمینی مسائل کے حل کے لیے سوا کروڑ کا تعاون پیش کیا۔ اس کے بعد انجمن کے جمود کو ختم کرنے کے لئے عام فلاحیوں کے مشورے سے 16 رکنی عبوری کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ عبوری کمیٹی نے ایک ماہ کی مسلسل مشاورت اور گفتگو کے بعد عام فلاحیوں کے تعاون سے انتخابی کمیٹی تشکیل دی۔ انتخابی کمیٹی نے انتخابی لوازمات کی تکمیل کے بعد نمائندگان کے انتخاب کا اعلان کیا۔ فلاحیوں کی جانب سے بھرپور تعاون ملا اور تقریباً 12 سو فارغین نے ووٹ دے کر انتخابات کو تاریخی بنادیا۔ انجمن کی تاریخ میں اس تعداد میں ووٹنگ کبھی نہیں ہوئی تھی۔

رمضان سے قبل نمائندگان کا انتخاب مکمل ہوگیا۔ اب نمائندگان کا کام شوری اور صدر کا انتخاب تھا۔ الحمدللہ مئی میں مادر علمی میں نمائندگان کا اجلاس ہوا۔ نمائندگان کی اکثریت نے آن لائن اور آف لائن شرکت کی۔ سب سے پہلے 21 رکنی شوریٰ کا انتخاب ہوا۔ اس کے بعد نمائندگان کی اکثریت سے جناب طارق اکرام اللہ کو صدر منتخب کیا۔

جناب طارق اکرام اللہ کا شمار جامعۃ الفلاح کے ابتدائی دور کے ممتاز فارغین (فضیلت: 1976ء) میں ہوتا ہے۔ تعلیمی، رفاہی اور سماجی میدان میں آپ کی خدمات ملک گیر سطح پر نہایت وسیع، مؤثر اور مختلف النوع ہیں۔ آپ 1981ء میں قائم ہونے والے معروف تعلیمی ادارے اسٹوڈنٹس

اسلامک ٹرسٹ (SIT) کے بانی جنرل سکریٹری ہیں۔اس کے علاوہ اسلامک ڈیولپمنٹ بینک (IDB) کے پروفیشنل ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت تعلیمی وظائف (Scholarships) کی نگرانی کرنے والے مینیجنگ ادارے کے کاؤنٹر پارٹ (مشرِف) کی ذمہ داری بھی انجام دے رہے ہیں۔مزید برآں، آپ سماجی و تعلیمی بیداری کے ممتاز ادارے سیڈ (Socio Economic(SEED Educational Society) کے چیف فنکشنری، نیز بلا سود مائیکرو فنانسنگ فراہم کرنے والے ادارے جن سیوا کریڈٹ کوآپریٹیو سوسائٹی کے بانی ڈائریکٹر اور رکنِ بورڈ ہیں۔

ان کے وسیع ادارہ جاتی، انتظامی، تعلیمی اور مالیاتی تجربے کے پیشِ نظر فارغینِ فلاح پُرامید ہیں کہ ان کی متحرک قیادت میں انجمن نہ صرف اپنی سابقہ روایت اور وقار کو مزید مستحکم کرے گی بلکہ خدمت کے نئے سنگِ میل بھی طے کرے گی، ان شاءاللہ۔

نمائندگان کے ذریعے شوریٰ اور صدر کے انتخاب کی تکمیل کے بعد مجلسِ شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں متعدد اہم فیصلے کیے گئے۔شوریٰ کے مشورے سے ڈاکٹر محمد اسامہ عظیم فلاحی کو سکریٹری انجمن اور جناب شمس الدین فلاحی کو خازن منتخب کیا گیا۔

اسی اجلاس میں بند پڑے حیات نو کی دوبارہ اشاعت کا فیصلہ ہوا۔ چند دنوں بعد شوری کی ایک آن لائن نشست کے ذریعے جناب خبیب کاظمی، مقیم حال قطر کو مجلّے کا مدیر منتخب کیا گیا۔محترم خبیب صاحب نے محنت کر کے ادارتی اور انتظامی ٹیمیں منتخب کیں اور حیاتِ نو کی دوبارہ اشاعت کو یقینی بنانے کے لئے بھرپور کوشش کی۔اللہ تعالیٰ انہیں جزاے خیر سے نوازے۔آمین

فارغین فلاح سے گزارش ہے کہ فلاح اور انجمن کے مقاصد کے حصول کے لیے حیات نو کی ملت میں زیادہ سے زیادہ نفوذ کی راہیں تلاش کریں اور اس کو ایک باوقار علمی اور فکری مجلہ بنانے میں تعاون کریں۔

ہمارا مقصد اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے افراد سازی کا عمل سب سے اہم ہوتا ہے۔افراد ہی کسی نصب العین کو حقیقت کا روپ دیتے ہیں۔ یہ افراد ہر قسم کی تنظیمی، جماعتی اور مسلکی عصبیتوں سے پاک ہونے چاہئیں۔ ورنہ یہ افراد اپنی افادیت کھو دیں گے اور ادارہ بھی اپنے مقاصد میں پیچھے رہ جائے گا۔

الحمدللہ فارغین بڑی حد تک مسلکی تعصّبات سے پاک ہیں، البتہ اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے حوالے سے صورت حال اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتی۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اس مجلّے کے ذریعے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆

# مختلف یونٹوں کے نومنتخب عہدیداران

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے فارغین دنیا کے مختلف ممالک اور ہندوستان کے متعدد شہروں میں یونٹوں کی صورت میں دینی، تعلیمی اور رفاہی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ یونٹیں باہمی ربط کے ساتھ مادرِ علمی کے پیغام اور مقاصد کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ نئی میقات کے آغاز پر مختلف یونٹوں میں انتخابی عمل مکمل ہوا، جن کے منتخب ذمہ داران کی تفصیل درج ذیل ہے:

| یونٹیں | صدر | سکریٹری | خازن |
|---|---|---|---|
| قطر | فیاض احمد فلاحی | نیاز احمد فلاحی | عبدالعزیز شہادت فلاحی |
| کویت | محمد سموئیل فلاحی | ندیم احمد | محمد عمر فخری فلاحی |
| ریاض | ڈاکٹر انعام اللہ بیگ فلاحی | مرزا فاران احمد بیگ | محمد راحیل اکرم فلاحی |
| جامعۃ الفلاح | مصباح الباری فلاحی | ابوحمزہ | مولانا عرفان احمد فلاحی |
| بلریا گنج | حافظ فیضان فلاحی | محمد سیف فلاحی | تنویر عالم فلاحی |
| جموں وکشمیر | ظفر اقبال فلاحی | منظور احمد ڈار فلاحی | محمود الریاض فلاحی |
| نیپال[1] | سراج احمد برکت اللہ | ڈاکٹر سلیم انصاری فلاحی | نسیم انصاری نور الدین میاں |
| دہلی | مدثّر عالم | اجمل عزیز | سرفراز احمد |

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام نومنتخب ذمہ داران کو اخلاص، صلاحیت اور حسنِ تدبیر کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور انجمن و مادرِ علمی کو مزید ترقی و استحکام نصیب فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

1 ارکان شوریٰ: نظر الحسن سراج الدین میاں۔ غلام رسول سبحان علی۔ حسن حبیب۔ عارف حسین محمد حسین۔ ذوالفقار علی۔ علاء الدین انصاری ضمیر میاں۔ اطہر علی حیدر علی۔ فیروز عالم محمد یونس۔ محمد ادریس سعید۔

# قلم کارانِ حیاتِ نو

## اس شمارے کو اپنے فکر و قلم سے زینت بخشنے والے احباب کا تعارف

1. ڈاکٹر محی الدین غازی فلاحی: معروف اسلامی مفکر، قرآن فہمی کے صاحبِ نظر قلم کار اور متعدد علمی و دینی تصانیف کے مصنف۔ مرکزی سکریٹری جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر زندگی نو، دہلی۔
2. ابوعبادہ عظیم فلاحی: دینی و اصلاحی موضوعات پر لکھنے والے فعال قلم کار۔ ندوۃ العلماء میں زیرِ تعلیم۔
3. ڈاکٹر رضوان الحق فلاحی: پی ایچ ڈی (انگریزی)، استاذ، ایم ایس آئی انٹر کالج، گورکھپور۔ سابق استاذ جامعۃ الفلاح انگریزی۔ اخلاقی، فکری اور علمی موضوعات پر لکھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔
4. محمد ارشد جمال: شعبۂ طب سے وابستہ استاد، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور میں ایسو سی ایٹ پروفیسر، علمی و سماجی شخصیات کے تعارف اور خدمات کے حوالے سے لکھنے والے قلم کار۔
5. امتیاز وحید: شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی سے وابستہ استاد اور اردو ادب کے شناسا قلم کار۔
6. سروری بانو: طویل عرصہ تک شعبۂ تدریس سے وابستہ رہنے والی کلیۃ البنات (جامعۃ الفلاح) میں معلمہ، علمی و اصلاحی موضوعات پر لکھنے کا ذوق رکھنے والی صاحبۂ قلم۔
7. بلال احمد فلاحی: فضیلت 2002، ایم فل (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)۔ پونہ میں شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ مغربی ایشیا کے مسائل اور عربی صحافت ان کے تحقیقی میدان ہیں۔ علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والے نوجوان قلم کار۔
8. اسد اللہ کاظمی: تحریکِ طلبۂ تنظیم SIO کے فعال رکن اور میقاتِ رواں میں ضلع فتح پور کے صدر۔ اسلامی تاریخ، سیرت اور تحریکی موضوعات سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے نوآموز مگر باصلاحیت نوجوان قلم کار۔
9. سید مطیع الرحمٰن حنیف فلاحی: قطر میں تحریک اسلامی کے زونل ذمہ دار۔ اتحادِ امت، اصلاحِ معاشرہ اور دینی موضوعات پر لکھنے والے سنجیدہ اہلِ قلم۔
10. محمد ضیاء القمر فلاحی: نوجوانوں کے مسائل، دعوتِ دین اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر لکھنے والے فعال قلم کار۔

11. ضیاء الرحمٰن عابد فلاحی: مظفر نگر۔ یوپی۔ (عالمیت 2025۔26)۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں زیرِ تعلیم۔ سیرتِ رسول ﷺ خصوصی دلچسپی کا میدان ہے۔ نوآموز نوجوان قلمکار۔

12. اسامہ احسن صدیقی فلاحی: لکھنو۔ سن فراغت 2023 مقیم حال: جلگاؤں، مہاراشٹرا۔

13. سماجی و دینی موضوعات، خصوصاً معاشرتی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے والے قلم کار۔

14. ڈاکٹر اسماء فیروز: اسسٹنٹ پروفیسر، ڈی ایم ایچ کالج آف ایجوکیشن، مالیگاوں، ناسک۔ خواتین، تہذیبی مسائل، اسلامی فکر اور عصری فکری چیلنجز پر لکھنے والی صاحبہ قلم۔

15. عبداللہ ندیم: صحافت اور دستاویزی فلم سازی سے وابستہ ہیں؛ انسانی کہانیوں، تاریخ اور تہذیبی روایت کی بازیافت ان کی دلچسپی کے بنیادی میدان ہیں۔

16. مصباح الباری فلاحی: استاذ شعبہ اعلیٰ جامعۃ الفلاح۔ احوال جامعہ، تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کی رپورٹنگ اور ادارہ جاتی موضوعات پر لکھنے والے قلم کار۔

17. ڈاکٹر محمد اسامہ عظیم فلاحی: میقاتِ رواں میں انجمن طلبۂ قدیم کے جنرل سیکریٹری، حِکم انسٹی ٹیوٹ میں لیکچرر، قانون کے طالب علم، اور سماجی و ملی سرگرمیوں سے وابستہ نوجوان قلم کار۔

18. سرفراز بزمی: سوائی مادھوپور راجستھان۔ معروف شاعر اور صاحبِ اسلوب قلم کار، جن کی شاعری اقبالی فکر، جرأتِ اظہار اور اصلاحِ معاشرہ کی آئینہ دار ہے۔

19. شاکر الاکرم: ناگپور (مہاراشٹر) سے تعلق رکھنے والے شاعر و قلم کار، امامت، خطابت، تدریس سے وابستہ، اور ادارۂ ادبِ اسلامی ناگپور کے صدر۔

20. یاسر انعام فلاحی: میڈیکل ٹورزم کے شعبے سے وابستہ ہیں اور بطور مترجم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دلچسپی کا موضوع قرآنیات

21. سعید اختر اعظمی: ریاض، سعودی عرب میں اردو کے مدرس، شاعر، افسانہ نگار اور ادبِ اطفال کے فعال قلم کار۔

☆☆☆

# حیاتِ نو: عکس و آواز

## فکری و تعلیمی سرگرمیوں کا تصویری و ویڈیو احوال

اس شمارے کے بعض خطابات، انٹرویوز اور خصوصی مواد QR Codes کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں۔ متعلقہ کیو آر کوڈ اسکین کر کے آپ براہِ راست ویڈیوز اور دیگر ڈیجیٹل مواد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

| نمبر شمار | ویڈیو کا عنوان | (QR Code) | نمبر شمار | ویڈیو کا عنوان | (QR Code) |
|---|---|---|---|---|---|
| 1 | تعلیمی رہنمائی عرب جامعات میں داخلہ: طریقۂ کار اور رہنمائی | | 2 | اپنی شخصیت کی تعمیر کیسے کریں؟ مقرر: ڈاکٹر طٰہٰ عبدالمتین صاحب | |
| 3 | فنِ خطابت اور اس کے آداب مقرر: مولانا طاہر مدنی صاحب (سابق ناظم جامعہ) | | 4 | بچوں کے ارتقائی مراحل کی نفسیات ایس۔ امین الحسن | |
| 5 | جنریشن الفا کی نفسیات مقرر: ایس امین الحسن | | 6 | دو روزہ تربیتی ورکشاپ (افتتاحی سیشن) | |
| 7 | ورکشاپ۔ مختلف لیکچرز۔ تدریسی نمونے۔ | | 8 | ترانۂ جامعہ | |

| | اردو | عربی | انگلش |
|---|---|---|---|
| تعارفی ویڈیوز جامعۃ الفلاح تیار کردہ: محمد ارشاد عالم فلاحی | | | |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾

’’اور میں نے جنّات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔‘‘

(سورۃ الذاریات 56:51)

محترم فلاحی بھائیو! ہم اس دنیا میں محض کھیل کود یا تفریح و دل لگی کے لیے نہیں آئے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عظیم مقصد کے ساتھ یہاں بھیجا ہے اور وہ یہ کہ ہم اس کی بندگی کریں، اپنے کردار کو قرآن کے مطابق ڈھالیں، اور بنی نوع انسانیت تک اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ آج دنیا گمراہی، بے چینی اور روحانی خلا کا شکار بن چکی ہے۔ ایسے وقت میں ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو قرآن کے نور سے روشن کریں، اور ساتھ ہی ساتھ محبت، اخلاص اور حکمت کے ساتھ اللہ کا پیغام دوسرے بندگان خدا تک پہنچائیں۔ یاد رکھیں! لوگوں کے دل ہمارے الفاظ کے ساتھ ساتھ ہمارے کردار سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ آیئے عہد کریں کہ ہم قرآن کو صرف پڑھنے تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ اسے اپنی زندگی کا عملی دستور بنائیں گے، تاکہ ہم واقعی اسلام کے سچے سفیر اور اللہ کے پیغام کے امین بن سکیں۔

**نیک خواہشات کے ساتھ**

**سید مطیع الرحمن حنیف**

# حیاتِ نو کی اشاعت میں اپنا تعاون پیش کیجیے

الحمدللہ ! ایک طویل تعطل کے بعد حیاتِ نو نئے انداز اور بہتر معیار کے ساتھ دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔ ہمارا عزم ہے کہ اسے بتدریج ماہنامہ کی صورت میں پیش کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل میں آپ کا تعاون نہایت اہم ہے۔

اگر آپ یا آپ کے ادارے کی کوئی تجارتی، تعلیمی، طبی، رفاہی یا سماجی خدمت ہے، تو حیاتِ نو میں اشتہار دے کر دوہرا فائدہ حاصل کیجیے:

حیاتِ نو پرنٹ اور ڈیجیٹل، دونوں صورتوں میں شائع ہوتا ہے۔ پرنٹ ایڈیشن ملک بھر میں قارئین تک پہنچتا ہے، جبکہ ڈیجیٹل ایڈیشن دنیا بھر میں ہزاروں افراد تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

خبیب کاظمی (ایڈیٹر) +97455445104

## مجوزہ اشتہاری نرخ

| نرخ | اشتہار کی جگہ/سائز |
|---|---|
| 13,000روپے | پچھلا سرورق، بیرونی رنگین صفحہ۔ |
| 10,000روپے | اندرونی سرورق۔ Front Inside Cover |
| 10,000روپے | اندرونی پچھلا سرورق ۔ Back Inside Cover |
| 5,000روپے | درمیانی دو آمنے سامنے صفحات۔ Center Spread |
| 3,000روپے | مکمل اندرونی صفحہ (سیاہ و سفید) Full Inside Page (Black & White) |
| 2,000روپے | نصف اندرونی صفحہ۔ Half Inside Page |
| 1,000روپے | چوتھائی اندرونی صفحہ۔ Quarter Inside Page |

نوٹ: یہ نرخ ابتدائی طور پر مجوزہ ہیں۔ اگر کسی ادارے یا مشتہر کو مستقل یا متعدد اشتہارات دینے ہوں تو مناسب رعایت پر بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ امید ہے آپ اس علمی و دعوتی کوشش کو کامیاب بنانے میں اپنا بھرپور تعاون فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ خیراً۔

VIP SHORT SHIFTING
PACKAGE HAJ 2027
HAJ
2027
ABOUT US
With 32 years of experience as specialists providing Haj & Umrah packages IQRA HAJ GROUP prides itself on providing a professional and high level of service to all it's customers.
We offer umrah packages throughout the year.
We make sure that your stay in the holy cities of Makkah and Madinah is comfortable and memorable.
SHIFTING PACKAGE
18 TO 21
DAYS
MADINAH
HOTEL HAYAH SALAM HOTEL / SIMILAR
(350 MTRS)
ARRIVAL 6 - 7 MAY 2027 TILL 10- 11 MAY
HOTEL AL KAUSAR
HOTEL NO STAR CATEGORY HOTEL
9 KM
11- MAY TILL 13 MAY
& RETURN ON 16 MAY TILL 21 MAY
NEAR HARAM MAKKAH
AL SHOHDA HOTEL / SIMILAR
600 MTRS
21 TO 25/26 MAY
ZONE 5 / D - CATEGORY
MOALLIM IN MINA
16 TO 20 MAY (HAJJ DURATION)
BOM TO BOM
₹7,50,000/-
INCLUSIVE OF ALL TAXES
4 PAX SHARING ROOM
₹9,00,000/-
INCLUSIVE OF ALL TAXES
DOUBLE SHARING ROOM
LIMITED SEATS AVAILABLE
PACKAGE INCLUDES
AIR TICKETS
VISA
GROUP ACCIDENTAL INSURANCE
ACCOMMODATION (4-5 PAX SHARING ROOM)
INDIAN BUFFET MEALS (BY EXPERT CHEF)
TRANSPORTATION TO OTHER CITIES BY AC BUSES
UNLIMITED LAUNDRY SERVICES
ZIYARAT AT MAKKAH AND MADINA MUNAWWARA BY EXPERT GUIDE
— MANDATORY NOTE —
• ANY INCREASE IN CAMP RATE AND MASHAER FEE HAJI WILL HAVE TO PAY THIS (CURRENT ZONE 5 & CURRENT CATEGORY -D)
• ANY OTHER INCREASE IN SAUDI EXPENSE WILL BE PAID BY PILGRIM ITSELF
• WEIGHT IN FLIGHT WILL BE ALLOWED AS PER AIRLINE RULES AND ALL TICKETS WILL BE IN ECONOMY CLASS
TERMS AND CONDITION APPLY***
KHADIM -
ABDUL AZEEM FALAHI
+91 9421892589
+91 9823040038
www.iqrahajtours.com
Iqra Tower, Telipura Chowk
Akola (MS). INDIA